طبِّ یونانی مین تازہ روح

شیدایان طب یونانی و مشتاقان علاج طب اسلامی کو مژدہ ہو کہ لکھنؤ مین ایک عظیم الشان دواخانہ موسوم بہ دواخانہ معدن الادویہ بہ سرپرستی عالیجناب راس الاطبا مسیح الملۃ جناب حکیم سید فضل علیصاحب عرف میرن صاحب قبلہ ایک عرصہ سے قائم ہے جسکے وجود سے لکھوکھا بندگان خدا فائدہ اُٹھا رہے ہین۔

اِس دواخانہ کا بہترین مقصد طبِ یونانی کے صیغہ ادویات و دواسازی کو ترقی دینا ہے اور ملک کے ضروریات کے مطابق اپنی ادویات کو تیار کرنا ہے چنانچہ بحمد اللہ صیغہ مفردات مین اعلی سے اعلی و کمیاب و نادرالوجود ادویات جمع کیے گئے ہین' تازہ سندی اور حتی الامکان مقام پیداوار سے مفردات مہیا کی جاتی ہین۔ بیشمار ایسے ادویات جو اطباء قدیم کے نسخون کے عمود مایہ ناز اجزاء تھے اور اب بوجہ کساد بازاری فن مفقود ہو چکے تھے مہیا کیے گئے ہین۔ سر سے پیر تک کے امراض کے مرکبات تیار کیے گئے ہین۔ ہر مرض کی دوا بنی ہوئی چھاننے بنانے جوش کرنیکے جھگڑے سے بچانے والے کہنہ و پیچیدہ امراض کا تیر بہدف علاج معاجین طلا حبوب۔ تکمید۔ ماء اللحم۔ جواہر مہرہ۔ خمیرہ جات۔ شربت غرضکہ ہر قسم کے مرکبات تیار ہین۔ مردون عورتون کے مخصوص علاج کے بےنظیر و زود اثر ادویات موجود ہین۔ فہرست دواخانہ مفت طلب کیجئے جسکے پڑھنے سے آپ سیکڑون امراض کا علاج کوڑیون مین خوب کر سکینگے۔

طبی مشورہ مفت

دواخانہ ہذا کے بورڈ اطباء سے ہر قسم کے مرض کا طبی مشورہ مفت حاصل ہو سکتا ہے عالیجناب مسیح الملۃ صاحب قبلہ خود بنفس نفیس ایسے مشورون مین شریک ہوتے ہین۔ خط و کتابت بصیغہ راز رہتی ہے زیادہ احتیاط مدنظر ہو تو رجسٹری شدہ خط روانہ کیجیے۔ جوابی ٹکٹ ضرور آنا چاہیئے۔

(فہرست دواخانہ مفت طلب فرمائیے)

المشتہر

مینیجر دواخانہ معدن الادویہ وکٹوریہ اسٹریٹ (لکھنؤ)

لکھنؤ کا قدیم مشہور

یونانی دواخانہ

پل فرنگی محل پاٹا نالہ

حضرات یہ دواخانہ تیس سال سے پبلک کی خدمت کامیابی کیساتھ بجا لا رہا ہے بفضل خدا ہر قسم کی مفرد و مرکب دوائیں نہایت اہتمام کے ساتھ بہم پہونچائی جاتی ہیں تاکہ خریداروں کو کوئی شکایت کا موقع نہو آج تک جن صاحب بھی اس دواخانہ کے خریدار بنے انکو دوسرے دواخانہ میں جانیکی نوبت نہ آئی دواؤں نے خاطر خواہ اثر کیا۔ حکیم نبا صاحب کے کل مجربات تیار رہتے ہیں اور انپر قیمت اتنی کم ہے کہ ہر امیر و غریب انکا استعمال کر سکتا ہے اور فائدہ اٹھا سکتا ہے جو نسخے یہاں تیاری کیلئے دیے جاتے ہیں انکا انتظام مالک دواخانہ اپنی نگرانی میں کرتے ہیں تاکہ خریدار اطمینان ہو۔ عرق اور شربت میں اس کارخانہ کو خاص امتیاز ہے۔ اگر دس قسم کے شربت ایک شیشی میں رکھ دیے جائیں تو دسوں فرق تو نہیں دیکھنے والے کو اندیشہ ہو جائے۔ یہ خصوصیت دوسرے دواخانوں کو میسر نہیں ہو سکتی۔

اس قسم کے دواخانے بہت سے کھلے اور ٹوٹ گئے مگر بحمد اللہ یہ دواخانہ اپنی پہلی سی آب و تاب کے ساتھ قائم ہے تمام حکماء اپنے اپنے خاص خاص نسخے خصوصیت کے ساتھ یہاں بھیجتے ہیں تاکہ انہیں اپنے علاج کے اثرات کا کافی اندازہ ہو۔ دوا کی برائی کا شک دل میں پیدا نہ ہو

اگر کسی صاحب کو اس قسم کی ضرورت ہو تو وہ ضرور اس کارخانہ کی آزمائش کریں انشاء اللہ انکو کوئی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

نوٹ۔ فرمائش پتہ صاف اور خوشخط لکھیے۔ اور چوتھائی قیمت پیشگی روانہ فرمائیے۔

سردار حسین منیجر دواخانہ یونانی پل فرنگی محل لکھنؤ

دوسرا سانحہ جانگزا انتقال حمید۔

جنابِ رشید مرحوم کے بعد اس خاندان میں لوگوں کی نظریں اُن کے بھائی جناب سید باقر مرزا صاحب حمیدؔ پر پڑنے لگیں۔ یہ مرحوم بھی نہایت کہنہ مشق اور خوش گو تھے۔ دُنیائے مرثیہ گوئی میں لوگ ان کو بھی نظرِ تحسین سے دیکھتے تھے۔ خصوصًا بعد وفات جناب رشید۔ مگر افسوس ہی کہ عالمِ پیری آپہنچا تھا ۱۴ ماہ صفر ۱۳۲۹ھ کو جنابِ حمیدؔ نے بھی بعارضہ تپِ وبائی مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ جنابِ حمیدؔ میں وہی پرانی وضع کے جوہر پائے جاتے تھے۔ اخلاق نہایت وسیع تھے۔ گفتگو نہایت نرم اور شیریں۔ اعزا و احباب سے ہمدردی کرتے تھے۔

اسی سال جناب نواب بہرام الدولہ بہادر نے اُنھیں حیدرآباد طلب فرمایا تھا۔ اور جناب رشید جن تاریخوں میں مجلسیں پڑھتے تھے اُن میں پڑھوایا تھا۔ مشہور ہی کہ حمیدؔ مغفور نے بھی جناب رشید کی طرح مقبولیت حاصل کی تھی۔ بعد ختم مجالس وہیں تپ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُسی حالت میں لکھنؤ واپس آئے اور چند روز کے بعد انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون +

اب رشید کے نواسے جناب میر سجاد حسین صاحب شدید بحمد اللہ موجود ہیں۔ جن سے اُن مرحوم کا نام روشن ہو سکتا ہی +

زبانِ اہلِ سخن پر یہ نوحۂ غم ہے — انھیں کا دم تھا کمالاتِ فن کو وجہ بقا

گئے عدم کو جو وہ زیبِ منبرِ مجلس — جناں میں پائی جگہ نزد سید الشہدا

نکاتِ نظم پہ قادر طبیعت فطری — زباں سے شعر جو نکلا وہ بے عدیل ہوا

رباعیات میں پیری کے یوں کہے مضمون — جوانوں کے لیے اندازِ وعظ تھے گویا

بہار مرثیوں کی وہ بہارِ دلکش تھی — کہ جس پہ بلبلِ سدرہ بھی والہ و شیدا

زباں وہ صاف کہ مانند موجۂ کوثر — مزا تھا بزم میں جس سے علی کی مدحت کا

سنواری شوق میں جب زلفِ شاہدِ اردو — خود آئی قدرتِ تخئیل بن کے آئینا

دکھائی بزم میں جب قدرتِ زباندانی — دلِ عدو بھی تھا حسنِ قبول کا شیدا

رشید مدح سرائی میں ایسے اکمل تھے — کلام جن کا سند اہلِ علم نے مانا

مریض ہو گئے یوں دفعتاً بڑھاپے میں — محال ہو گیا بارِ حیات کا اٹھنا

محال ضعف سے فالج کے گو کہ جنبش تھی — مگر گئے سوئے اجداد جبکہ آئی قضا

سحر کا وقت تھا ذیقعدہ کی تھی بست و ششم — کہ آفتابِ کمالات زیر خاک چھپا

لحد پہ بڑھے احباب فاتحہ کے لیے — ہر ایک آنکھ سے جاری تھا اشکوں کا دریا

وہیں پہ قبر بنی جس جگہ یہ سوتے تھے — بس ایک ہی تھا حیات و وفات کا نقشا

شمیم قبر کے پھولوں کی دے رہی تھی خبر — وہ پہنچا مدح سرا سوئے جنت الماوا

سنِ وفات یہ مختصر سے کہہ اٹھا رضوان — ہر ایک بیت پہ اک پاک گھر ارم میں ملا

۱۳۴۶ھ

منظومہ جناب سید ظہور حسین صاحب فروغ سیتاپوری

چلا گیا ماتمِ پیر درد رشیدِ یکتا — رفت زیں دارِ فنا کاملِ اعجاز بیاں

۱۹۱۸ء — ۱۳۴۵

وائے رودادِ چنیں واقعۂ صعب فروغ — واقفِ فنِ سخن حیف نماندہ بجہاں

سنہ ۱۹۲۵ — ۱۳۴۶ھ

بیٹھے تھے کہ نماز میت کے لیے صفیں مرتب ہوئیں - رشید کے محترم دوست جناب مولوی محمد سید حسین صاحب قبلہ علامۂ ہندی مرحوم نے نماز میت پڑھائی - چاروں طرف سے آواز بکا بلند تھی - لکھنؤ کی وہ مشتِ خاک جو خونِ شرافت اور جوہر کمال سے خمیر ہوئی تھی ہمیشہ زیرِ زمیں نہاں ہونے والی تھی - اعزا الگ گریاں تھے احباب الگ خروشاں - علما الگ آبدیدہ - چنانچہ افقہ زماں مولانا سید باقر صاحب قبلہ مجتہد العصر نے جناب حمید مرحوم سے دردآمیز لہجہ میں فرمایا "آج ہم میں سے ایک صاحبِ کمال اُٹھ گیا" اُن کے علاوہ اور دوسرے مجتہدین اولو العزم مثلاً شمس العلما جناب مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ - شمس العلما جناب مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ - زبدۃ العلما جناب سید آقا حسن صاحب قبلہ - جناب مولانا سید سبطِ حسن صاحب قبلہ - جناب مولانا سید محمد رضا صاحب قبلہ مرحوم اعزا کو تلقین صبر فرما رہے تھے +

چونکہ امام باڑہ کے اُس حجرہ میں جہاں تعشق و صابر وغیرہم مدفون ہیں بالکل جگہ نہ تھی - اس لیے اُس دالان میں جو زیرِ مسجد ہے مدفون ہوئے + جمعہ کو مجلس فاتحہ خوانی ہوئی - اور بائیس ذی الحجہ بروز یکشنبہ امام باڑہ جناب سید تقی صاحب اعلی اللہ مقامہٗ میں مجلس چہلم ہوئی - اور متعدد قطعات تاریخ پڑھے گئے - جن میں سے اختصاراً چند درج کیے جاتے ہیں +

منظومۂ مداحِ آلِ محمد جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

ہزار حیف جہاں سے اُٹھے جناب رشید	ریاض مدح میں اک حشر ہوگیا برپا

اس واقعہ کے تیسرے روز سے ایسے صاحب فراش ہوئے کہ پھر نہ اُٹھے +

وفات و دفن

اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ رشید بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اُن کی گفتگو سے مترشح ہوتا تھا کہ موت کا شدید انتظار کر رہے ہیں۔ جو ملنے جاتا تھا اس سے ایسی مایوسانہ تقریر کرتے تھے کہ کچھ نہ کچھ اثر لے کے اُٹھتا تھا۔ کہ یکا یک شب پنجشنبہ چودہ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ ہجری کو تن لاغر پر فالج گر کے خبر دی کہ اب ادبی دُنیا پر رشید کا احسان ختم ہوتا ہے۔ زبانِ انیس خاموش ہوتی ہے۔ وہ وجود جو پرانے اوضاع و اطوار کا آخری نمونہ تھا۔ راہ و فناطے کر کے ملک بقا آباد کرنے والا ہے۔ صبح ہوتے ہوتے رشید کی خبر علالت تمام شہر میں مشتہر ہو گئی۔ اعزا و احباب اس وجودِ مغتنم کی عیادت کو جوق جوق آنے لگے + رشید بے حس حرکت پڑے تھے۔ اذلئے شکریہ کا زبان کو یارا نہ تھا۔ جو شخص سامنے آتا تھا۔ سلام کو پہلے ہاتھ اُٹھا دیتے تھے۔ روزِ علالت سے چودہ دن تک اسی حالت میں رہے۔ شہر کے ممتاز اطبا مثلاً جناب حکیم مُنے آغا صاحب فاضل۔ جناب حکیم سید مظفر حسین صاحب طبیب جناب حکیم سید امیر حسین صاحب مرحوم۔ جناب حکیم جعفر حسین صاحب وغیرہم یک رائے ہو کر مصروف تدبیر تھے لیکن موت کا کیا علاج۔ آخر کار چوہتر برس کی عمر کے بعد بروز چہارشنبہ ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ ہجری وقت سحر اس دُنیا کے نمائشی منظر کو خیرباد کہہ کے ملکِ بقا میں روحانی زندگی کی ابتدا کی۔ اعزا و احباب کو اپنی یاد کا غم دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

صبح کو ہزاروں آدمیوں سے میر عشق کی بقیہ بھری ہوئی تھی۔ لکھنؤ کے ہر طبقہ کے لوگ شرکت تجہیز و تکفین کا آخری احسان رشید کی روح پر کرنے کو

کی لذّت جن کو حاصل ہو وہ اُسے ایک نعمتِ عُظمےٰ سمجھتے ہیں۔ ہر وقت میں رشید اس نعمت سے متنعم ہوے اور نہایت خوبی سے نباہا +

جناب رشید نے اپنے کلام میں پیری کو اس قدر آوازیں دی تھیں کہ وہ اُن کے پاس عین وقت پر آ پہنچی تھی۔ اعضا جواب دے چکے تھے۔ جب کوئی ملنے جاتا تھا تو فرماتے تھے "ہم گھٹ رہے ہیں اور ناتوانی بڑھ رہی ہے"۔ جن لوگوں نے اُن کو قوی و تندرست دیکھا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر اکثر آبدیدہ ہو جاتے تھے +

صورت یہ تھی کہ پچہتّر ۷۵ برس کا سِن۔ وہ کمر جس میں کبھی تلوار بندھتی تھی بارِ سالہا سے جھکی ہوئی۔ وہ آنکھیں جنھوں نے ایک عمر دُنیا کی مختلف نمائشوں کی سیر کی ضعفِ بصر کی شاکی۔ وہ ہاتھ جنھوں نے زلفِ پریشانِ سخن آراستہ کی ضعف سے مرتعش۔ وہ سر جس کے مختلف گوشے کبھی شاعرانہ نازک خیالیوں سے مملو تھے معمولی مسافت سے بے کار۔ وہ زبان جو زبانِ انیس کی ترجمان تھی دُنیائے سخن کی ناگوار شورش سے خاموش۔ مگر رشید اب بھی وہی رشید تھے۔ اگر کوئی وقتِ آزمائش آ پڑتا تو اُن کی قوتِ شاعرانہ اُسی طرح کام کرتی جیسے تیس برس قبل +

چنانچہ ایک مرتبہ مکان سے اپنے چھوٹے بھائی جناب کلن صاحب کے یہاں جا رہے تھے۔ مسافت سو قدم سے زیادہ نہ ہوگی کہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ اتفاق سے اُسی وقت کچھ حضرات ملنے آ رہے تھے اُنھوں نے جلدی سے اُٹھایا۔ رشید نے فوراً شکایتِ ضعف میں یہ شعر پڑھا ؎

ضعف نے اوج بڑھایا ہے یہ قسمت کا
پاؤں کرتے ہیں ارادہ مری پامالی کا

ہادی یہ نصیریوں کی ملت والے
لیکن اُن کا مذاق تھا غیر سلیم
تھے رند اسی نشۂ اُلفت والے
اتنی پی لی کہ ہو گئے متوالے

موتی سے گئے وہ دانت ہیہات کہاں
ہادی بنوا کے دانت کیا کام بنا
اب لہجۂ و لب میں وہ مساوات کہاں
گو بات نکلتی ہے یہ وہ بات کہاں

تلامذۂ جناب رشید

یوں تو جناب رشید کے شاگردوں کی اگر فہرست لکھی جائے تو طویل ہو گی۔ مگر یہ چند حضرات قابل ذکر ہیں۔ نواب تراب علی خاں صاحب سعید۔ نواب جان خاناں بہادر۔ جناب سید باقر صاحب حمید۔ جدید سید عسکری مرزا صاحب موذوب سجاد حسین صاحب شدید۔ مہدی حسن صاحب ناصری پروفیسر۔ احمد حسین عرف منھو صاحب شفیق (صاحب دیوان) ابو صاحب جلیس۔ حقیر مؤلف۔ نواب بڈھن صاحب فسر ہاد سید مہدی حسین صاحب مہدی۔ سید انور حسین صاحب انور۔ احمد خاں صاحب نظم منشی حامد حسین صاحب حامد +

واقعات آخر عمر

جیسا اوپر بیان ہوا۔ رشید نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی فن کے کرنے والے اپنی زندگی کے آخری کنارہ پر پہنچنے لگتے ہیں۔ تو زمانہ دوسرے افراد اُن کی قائم مقامی کے لیے تیار کرنے کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ رشید۔ عارف اوج۔ جاوید کے بعد مرثیہ گوئی کے قیام کے لیے چند نو خیز خاندانی مرثیہ گو میدان امتحان میں خم ٹھوک کر آ کھڑے ہوئے اور بمفاد کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ۔ عوام نے بھی اُن کی طرف غیر معمولی دلچسپیوں کا اظہار کیا۔ اور جانبداری میں اس قدر افراط و تفریط سے کام لیا کہ پرانے نفوس گوشہ گیر ہو گئے۔ اگر مرثیہ گوئی اُن کا ذریعہ معاش نہ ہوتا تو غالباً سب کے سب گوشہ گیر ہو گئے ہوتے۔ اور پھر کوئی اُن کی صورت نہ دیکھتا۔ کنج عزلت و قناعت

چند رباعیاں جناب رشید کو سنائیں۔ بہت خوش ہوئے۔ تحسین کلام ان الفاظ
میں فرمائی "آپ کا رنگِ سخن بالکل نیا ہی۔ اور زبان بھی بہت خوب ہی" جناب
سید صاحب جعفر منزل (قیصر باغ) میں مقیم تھے۔ دوسرے روز جناب رشید
بازدید کی غرض سے تشریف لائے۔ جناب سید صاحب نے چاہا کہ وہ ایک مجلس لکھنؤ میں
منعقد کریں اور جناب رشید رونق افروز ممبر ہوں۔ مگر چونکہ جنابِ رشید نے
لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ اس وجہ سے مجلس نہوئی۔ جناب سید صاحب نے اپنے
دولت خانہ پر (سلطان پور میں) ایک مجلس کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور جناب رشید
سے وعدہ لیا۔ مگر یہ مجلس بوجہ علالت جناب سید صاحب عرصہ تک نہو سکی۔ اور جنابِ
رشید راہی عدم ہوئے۔ چند رباعیاں جو جناب ہادی صاحب نے جنابِ رشید
مغفور کو سنائی تھیں از راہِ کرم مجھ کو عنایت فرمائی ہیں۔ ذیل میں درج کرتا ہوں +

رباعیات	
ہادی تو اور کسی خطا سے نہ ڈرے اس نازشِ حُبِ مرتضےٰ سے ڈر کر	حیرت ہی کہ نار بھی بلا سے نہ ڈرے ایسا تو نہو کہیں خدا سے نہ ڈرے
کیونکر کوئی اُمتی نبی سے نہ ڈرے یہ دونو خدا سے ہیں ڈرانے والے	مومن کیسا اگر علی سے نہ ڈرے جو ان سے ڈرے وہ کسی سے نہ ڈرے
دُنیا کی ہوس ہی دین کی ہادی آہ روزے غائب نماز گاہے گاہے	تو اور یہ راہ واہ اے ہادی واہ مولا کا غلام اور یہ آزادی واہ
سرمست ولا نبی کی صحبت والے بوذر مقداد ابنِ یاسر سلمان	تھے رند کئی بڑی محبت والے اُس بزم کے یہ چھنٹے ہوئے متوالے

الائچیوں کا شکریہ	جو دانہ ہے مشک کی طرح بے شک ہے ہر ایک الائچی ہے ایسا غنچہ		تخم اُلفت سمجھ لے گر زیرک ہے جس کی خوشبو دماغ سے دل تک ہے	
چاء کا شکریہ	آنے پہ شکریہ کو تیار رہوں میں اس چاء میں کیف ہے مئے اُلفت کا		ضعف پیری جو ہے تو ناچار ہوں میں ساقی سید حسین میخوار رہوں میں	

پہلی اور تیسری رباعی بالکل صاف ہیں۔ مگر دوسری رباعی بہت خوب کہی ہے۔ الائچی کے دانہ کا تخم اُلفت سے ایسا استعارہ کیا ہے کہ سُبحان اللہ۔ اور پھر زیرک بھی بہت خوب ہے +

رشید کانپور اور سلیم پور میں

جب جناب رشید نے لکھنؤ میں ترک مرثیہ خوانی کا اعلان کر دیا۔ تو اُن کے کلام کے سچے دلدادہ شکستہ خاطر ہوئے۔ اور دعائیں مانگتے تھے کہ رشید کسی طرح پڑھیں اور وہ سُنیں۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ ہر قسم کی کوشش جناب رشید کے لکھنؤ میں پڑھوانے کے لیے ناکامیاب ہے۔ تو یہ عزم کیا کہ اگر رشید لکھنؤ کے اطراف میں بھی پڑھینگے تو سُننے جائیں گے۔ چنانچہ ایک شخص میر کاظم حسین صاحب نے کوشش کی اور وعدہ لیا۔ کہ وہ ماہِ صفر میں ایک مجلس کانپور میں پڑھیں۔ چنانچہ رشید حسب وعدہ ہر سال وہاں گئے + یہ مجلس بڑے امام باڑہ واقع محلہ پٹکاپور میں ہوتی تھی۔ علاوہ اطراف کے مومنین کے لکھنؤ سے تقریباً دو ڈھائی سو آدمی جایا کرتے تھے۔ اور مجلس ایک بڑے مجمع سے ہوتی تھی +

جناب راجہ صاحب سلیم پور کے یہاں بھی ایک مجلس اسی زمانہ میں پڑھتے تھے روزِ مجلس صبح کو راجہ صاحب کا موٹر آجاتا تھا رشید چلے جاتے تھے۔ اور بعد ختم مجلس واپس آتے تھے راجہ صاحب ایک معقول رقم دیتے تھے +

ایک مرتبہ سنہ ۱۹۱۰ء میں جناب خان بہادر سید محمد ہادی صاحب ہادی ڈپٹی کمشنر پنشنر جناب رشید کی ملاقات کے لیے رکاب گنج تشریف لائے۔ سید صاحب موصوف نے

جنت شدّاد کا سماں بھی سامنے سے گذر جاتا تو اُن کا خیال نہ بھٹکتا۔ چنانچہ ایک مرثیہ میں نجف سے مخاطب ہو کے کہتے ہیں +

	جس سے ملتا ہے خدا تیری محبت ہو وہ شئے مئے اُلفت کے تصور میں سراپا ہوں پَئے		مئے بخشش سے بھلا کب مجھے مایوسی ہے نشہ بڑھتا ہے اُسی کا ہوں میں ہر دم درپے	

کب میں ناکام رہا روز مرا کام بنا
دل اگر بیٹھ گیا ذرۂ تہ جام بنا

کلکتہ میں بھی جناب رشید کے احباب ایسے ہی کمال شناس اور ذی رتبہ تھے جیسے حیدرآباد وغیرہ میں۔ مگر اُن سبھوں میں جناب سید حسن صاحب شوستری رئیس کلکتہ کو جناب رشید سے بے حد حسنِ عقیدت تھا۔ جب جناب رشید کلکتہ پہنچتے تھے حتی الوسع سید صاحب موصوف سے جلد سے جلد ملنے کی کوشش کرتے تھے +
ایک مرتبہ جناب رشید سید صاحب سے ملنے گئے۔ اثنائے گفتگو میں چاء اور الائچیوں کا ذکر آگیا۔ کسی صاحب نے کہا "بروک بونڈ" اچھی ہوتی ہے۔ کوئی بولا لپٹن کم خرچ بالانشین ہے۔ غرضکہ حاضرین نے اپنی مختلف رایوں کا اظہار کیا۔ اب جناب رشید کی باری آئی تو فرمایا "جو زیادہ رنگین ہو وہی عمدہ" سید صاحب چونکہ حسنِ عقیدت رکھتے تھے سمجھے کہ رشید کو چاء اور الائچیاں مرغوب ہیں۔ لہذا جب رشید لکھنؤ واپس آئے تو چند دنوں کے بعد سید صاحب نے الائچیاں اور چاء تحفۃً رشید کو روانہ کیں۔ رشید نے تین رباعیاں بطور شکریہ لکھ بھیجیں اور وہ یہ ہیں +

	گردوں سے زمین پر من و سلوا پہنچا مجھ کو مرے دوست کا عطیہ پہنچا		ناچیز کو بھیجا تھا جو تحفہ پہنچا بس اس کا عوض یہ ہے دعاؤں میں رشید	تحفہ شکریہ وصول

مرزا غالب اور کلکتہ کے نظر فریب مناظر

فطرتی مناظر کا حظ یورپ کے شعرا نے جیسا اُٹھایا ہی مشرقی حصّوں کے شعرا نے ویسا نہیں اُٹھایا۔ اور اگر اُس سے فائدہ اُٹھایا بھی تو ایسے ہی شعرا نے جن میں فطرت نے نظارے سے اثر لینے کی قوت پیدا کر دی تھی +

جس کلکتہ کی سیر رشید نے نہیں کی اُسی کلکتہ کو ہمارا ذکی الحس مست خیال شاعر غالبؔ دہلی میں بیٹھا ہوا یوں یاد کرتا ہی +

قطعہ

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں	اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہی غضب	وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر	طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا	وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

وہاں کی مغربی طرز کی آبادی۔ جا بجا پائیں باغ۔ ولائتی جکڑ اور اُس کی سر شام ارغنوں سازی حسینانِ پارسی و فرنگ کی آزاد ہوا خوری۔ ان سب کے اثر سے غالبؔ ایسا دل و نظر رکھنے والا کہاں تک بچتا + بالآخر کسی وقت کیف شراب میں گنگنا اُٹھا۔ کہ ؎

وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

حقیقت تو یہ ہی کہ مصرعۂ آخر کا تابع تمام قطعہ ہی۔ پرتگال اور فرانس سے چلی ہوئی پہلے مدراس۔ بمبئی۔ کلکتہ کے بندرگاہوں پر کھلتی ہی اور وہاں کے قدح نوشوں میں تازے دور چلتے ہیں +

رشید کو اُس سے کیا علاقہ تھا۔ اُن کے دماغ کو تو میخانۂ جنت۔ ساقی نجف ساغر کوثر۔ حورانِ خوش منظر سب کے سب اپنی طرف اس قدر متوجہ رکھتے تھے کہ اگر ایک دفعہ

کلکتہ میں مجلسیں پہلی ربیع الاوّل سے شروع ہوتی تھیں۔ اور دس کو ختم ہوتی تھیں۔ جنابِ رشید آٹھ روز قیام فرماتے تھے۔ خواجہ عشرت نے لکھا ہی کہ عشرہ پڑھتے ہیں مگر نہیں۔ جنابِ رشید نے ایک مجلس پہلی سال جناب نواب صاحب کی کوٹھی میں پڑھی تھی جو کلکتہ میں ہی اور سفارت خانہ کے نام سے موسوم ہی۔ اُس کے بعد سے سفارت خانہ میں دو مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ اور ایک مجلس امام باڑہ فردوس محل واقع ٹیا برج میں اور بس۔ جناب نواب صاحب رشید کو تین سو پچاس روپیہ مرحمت فرماتے تھے +

جنابِ رشید حالانکہ برابر حیدر آباد اور کلکتہ جاتے رہے۔ مگر یہ بات حیرت انگیز ہی۔ کہ نہ تو اُنھوں نے خاص طور سے حیدر آباد کی سیر کی نہ کلکتہ کی۔ لوگوں نے اکثر کہا بھی مگر جواب دیا "میں ضعیف ہوا سیر و تفریح تو جوانوں کو زیبا ہی"

خدائے سخن میر علیہ الرحمہ کا بھی ایک واقعہ "آبِ حیات" میں یوں بیان کیا گیا ہی کہ اُن کو لکھنؤ کے ایک مرتبہ شناس نواب ہاتش کی تکلیف میں دیکھ کر معہ اہل و عیال اپنے مکان پر لے گئے اور محل سرا کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا۔ نشست کے کمرہ کی کھڑکیوں کا رُخ باغ کی طرف تھا۔ میر صاحب جب وہاں تشریف لے گئے تو کھڑکیاں بند پڑی تھیں اور اُسی طرح کئی برس اُن کی موجودگی میں بھی بند پڑی رہیں۔ اُن کو کھول کر کبھی باغ کی طرف نہ دیکھا ایک دن کوئی دوست آئے۔ اُنھوں نے کہا کہ اُدھر باغ ہی آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے۔ میر صاحب بولے۔ کیا اُدھر باغ بھی ہی۔ اُنھوں نے کہا۔ اسی لیے نواب صاحب آپ کو یہاں لائے تھے کہ آپ کا جی بہلتا رہے اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے سامنے پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے اُن کی طرف اشارہ کرکے کہا "میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اُس باغ کی خبر ہی نہیں" +

ہوئے + تعجب ہوتا ہے کہ مابین حضور نظام و رشید تعلقات سخن گوئی اس حد تک پہنچ چکے تھے۔ اور مراحمِ خسروانہ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی رشید کی قسمت نے کوتاہی کی۔ کہ نسلاً بعد نسلٍ کوئی انتظام فارغ البالی نہوا۔ ہاں۔ ایک سال قبل انتقال علیحضرت نے رشید سے فرمایا تھا "آپ کے لیے انشاءاللہ میں کچھ سامان کر دوں گا" مگر افسوس ہے کہ رشید کی قسمت نے یاوری نہ کی۔ یعنی آنجہانی حضور نظام کی زندگی نے وفا نہ کی +

رشید کلکتہ میں | جناب رشید کو اُن کا کمال اور ضرورت ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں لیے لیے پھری۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں نواب نصیر الممالک مرزا شجاعت علی خاں بہادر عازمِ کے یہاں تشریف لے گیے۔ اوّل دو تین سال تک نوّاب صاحب موصوف اور جنابِ رشید سے سلسلۂ خط و کتابت جاری رہا۔ اسی اثناء میں حکیم صادق حسین صاحب خلف حکیم حیدر حسین صاحب سے اس معاملہ میں گفتگو رہی۔ مگر رشید کی خودداری نے اُن کو اجازت نہ دی۔ مایحتاج سے کچھ زیادہ اُن کو حیدر آباد سے مل جاتا تھا۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ ہوس مزید سے اپنے دامنِ کمال کو آلودہ کرتے۔ چونکہ جناب نوّاب صاحب خود وسیع النظر اور کمال شناس افراد میں سے ہیں۔ اس وجہ سے جب جنابِ رشید نے معمولی تحریک سے اُن کے یہاں جانے سے پہلو تہی کی تو نواب صاحب نے بھی یہ مرحلہ وقتِ ملاقات تک ملتوی رکھا۔ چنانچہ جب غالباً سنہ ۱۹۰۹ء میں اجلاس شیعہ کانفرس کی شرکت کے لیے جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ تشریف لائے تو جنابِ رشید سے ملنے گئے فرمایا "میں اب آپ سے زبانی وعدہ لیتا ہوں" رشید نے وعدہ کر لیا۔ اور اُسی سال سے ماہ ربیع الاول میں تشریف لے جانے لگے +

انعقاد مجالس مزید

اوپر ذکر کی ہوئی چودہ مجلسیں نواب بہرام الدولہ بہادر کی مقررہ دس مجلسوں کے علاوہ حضور نظام کے حکم سے قائم کی گئی تھیں۔ ان مجالس کے برپا ہونے کا خاص سبب ظاہری وہ یہ کہ رشید کے کمال نے حضور نظام کے اشتیاق کلام کو روز بروز ترقی دینی شروع کی۔ جس قدر زیادہ سنتے گئے اسی قدر زیادہ محظوظ ہوتے گئے جب دس مجلسوں میں شگفتگی سُن کے سیری نہوئی تو نواب بہرام الدولہ بہادر کو حکم ہوا کہ پانچ مجلسیں اور کی جائیں۔ مابدولت شرکت کرینگے۔ چنانچہ تعمیل حکم کی گئی۔ پانچویں مجلس میں پھر ارشاد فرمایا کہ اور چند مجلسیں ہوں۔ مجلسیں ہونے لگیں اور رشید کے جوہر کھلنے لگے۔

جناب رشید کے یہے روز ایک مجلس بڑھنی گئی اور حضور نظام شرکت فرماتے رہے یہاں تک کہ جب تیرھویں مجلس کی نوبت پہنچی تو نواب بہرام الدولہ بہادر سے ارشاد ہوا "کہاں تک مجلسیں بڑہائی جائیں گی اب کل آخری مجلس ہو"

چودھویں مجلس میں حضور نظام جب تشریف لائے تو رشید کو اپنی ایک رباعی پڑھنے کو عنایت کی جو مضمون رخصت پر مشتمل ہے۔

آصف عشق شہ دیں کا یہ اثر پاتا ہوں ہر روز جو میں جاتا ہوں او آتا ہوں
منظور الٰہی ہو تو پھر آؤں گا یا حافظ و ناصر میں کہے جاتا ہوں

جناب رشید کی برق مثال فکر نے بھی فوراً ذیل کی رباعی اسی ردیف و قافیہ میں موزوں کی اور اس کے بعد پڑھی +

رشید۔ پیری سے ضعف گو بہت پاتا ہوں پھر فصل عزا آئے کہ پھر آتا ہوں
حافظ ہو وہ حضرت کو اسی سے لونگا میں جس کی حفاظت میں دیئے جاتا ہوں

اب مجلسیں ختم ہوئیں اور جناب رشید علاوہ رقم مقررہ کے عطیہ خزانہ شاہی سے بھی بہرہ ور

سنا شبیرؑ کا نام اور اک بجلی گری دل پر
جو دل میں درد رکھتے ہیں وہ مضطر ایسے ہوتے ہیں

فرشتوں نے کہا جب سر کٹاتے آپ کو دیکھا
ولی اللہ کے اللہ اکبر ایسے ہوتے ہیں

کھڑے عباس کے لاشہ پہ یوں شبیر کہتے ہیں
برادر پر ہوئے قرباں برادر ایسے ہوتے ہیں

لڑے اس ڈھنگ سے اکبر کہ دشمن بھی پکار اٹھے
بہادر ان کو کہتے ہیں دلاور ایسے ہوتے ہیں

زمیں سے عرش پر پہنچا دیا شبیر نے حر کو
خدا کے خاص بندے بندہ پرور ایسے ہوتے ہیں

غضب کا معرکہ تھا معرکہ عشقِ حقیقی کا
کیا سر آپ نے سر دے کے سرور ایسے ہوتے ہیں

مرے آئینۂ دل میں ہے جلوہ ماہِ زہرا کا
سکندر سے کہو دیکھے سکندر ایسے ہوتے ہیں

تن سرور پہ جتنے زخم تھے وہ سب بتاتے تھے
چھری۔ تلوار۔ برچھی۔ تیر۔ خنجر ایسے ہوتے ہیں

محبت زینب و شبیر کی دیکھو تو ظاہر ہو
کہ خواہر ایسی ہوتی ہے برادر ایسے ہوتے ہیں

لب و دندانِ شہ سے اور ہی کچھ بات پیدا ہے
نہ لعل اس رنگ کے دیکھے نہ گوہر ایسے ہوتے ہیں

لڑے بچے جو زینب کے تعجب اس پہ بیجا ہے
کہ جو شیروں میں پلتے ہیں وہ اکثر ایسے ہوتے ہیں

نہائے خون میں اصغر تو بانو سے کہا شہ نے
کہ دیکھو باغِ جنت کے گلِ تر ایسے ہوتے ہیں

عدو بھی رہ گئے حیراں جو دیکھا صبر حضرت کا
یہ کیا معلوم تھا سبطِ پیمبر ایسے ہوتے ہیں

جو تڑپے خون میں اکبر تو زینب نے کہا رو کر
کہ دریائے شہادت کے شناور ایسے ہوتے ہیں

مظالم کربلا کے سن کے حیرت اس پہ ہوتی ہے
کہ یہ مٹی کے پتلے دل کے پتھر ایسے ہوتے ہیں

زمیں بولی فلک سے دیکھنا زہرا کے پیاروں کو
جو دن کو بھی چمکتے ہیں وہ اختر ایسے ہوتے ہیں

جو پوچھا تیغ قاتل نے کہ عاشق کیسے ہوتے ہیں
تو شہ بولے گلے اس کو لگا کر ایسے ہوتے ہیں

پھڑک کر شہ کی شہ رگ کہہ رہی تھی اپنے قاتل سے
کہ پیاسوں کے گلے مشتاق خنجر ایسے ہوتے ہیں

مزا کیا دے رہے ہیں دیدۂ تر اپنے اے آصف
یہ ہمنے آج جانا جامِ کوثر ایسے ہوتے ہیں

(۱) رشید (درجواب)	پیری میں جوان بن کے دیکھوں گا میں	اک جامہ نیا پہن کے دیکھوں گا میں
	حضرت نے جواں کہا سنا تو نے فلک	ہر بار اب تجھ کو تن کے دیکھوں گا میں

شاید دوسرا مصرعہ علاوہ دیگر محاسن کے خلعت کے حسنِ طلب میں ہے۔ اسی حال حضور نے خلعت مرحمت فرمایا تھا۔ ذیل کی رباعی بھی اسی مضمون کی تائید کرتی ہے۔

رشید =	ہر اک دم اضطراب ادھر آتا ہے	گرمی میں ماہتاب ادھر آتا ہے
	سلطان دکن سے مانگتا ہے خلعت	جاڑے میں آفتاب ادھر آتا ہے
(۲) آصف =	گو پیر ہیں پر طبع کی جودت دیکھو	ہر شعر میں ہر بات میں جدّت دیکھو
	کہتے ہیں یہ آصف سے مضامینِ رشید	پیری میں جوانی کی طبیعت دیکھو
(۱) رشید =	حضرت کی یہ اعجاز بیانی دیکھی	پیری کی نہ ذرہ بھی نشانی دیکھی
	آداب بجا لاتے ہی تھا رنگ کچھ اور	جھک کر جو اٹھا میں تو جوانی دیکھی
(۳) آصف =	کیا خوب سخن تم نے سنایا ہے رشید	مضمون کا اک باغ لگایا ہے رشید
	پیری میں یہ زورِ طبع ماشاءاللہ	کیا رنگ جوانی کا دکھایا ہے رشید

ممکن ہے کہ کسی مرثیہ کی بہار بہت پسندِ خاطر ہوئی ہو۔ اور اُس کی داد میں یہ رباعی ارشاد فرمائی ہو۔

(۳) رشید =	قابو میں کبھی نہ لا سکے گی مجھ کو	ڈھونڈھے گی مگر نہ پا سکے گی مجھ کو
	اعلیحضرت نے سرفرازی بخشی	پیری اب کیا جھکا سکے گی مجھ کو

اس رباعی کی روانی اور تیور دیکھنے کے قابل ہیں جن طبیعتوں میں ذوقِ سخن خداداد ہے وہ اس کے مزے خوب لیں گے۔
ذیل کا سلام حضور نظام کے اُن سلاموں میں سے ہے جو رشید کو مرحمت ہوئے تھے۔

آصف =	سلامی دیکھنا اشکوں کے گوہر ایسے ہوتے ہیں	لیے ہیں شہ نے دامن میں مقدر ایسے ہوتے ہیں
	مضامینِ غمِ سرور ذرا دل تھام کر سنیے	رگِ جاں کھول دیتے ہیں یہ نشتر ایسے ہوتے ہیں

کوئی انتہا نہ ہوتی تھی +

حضور نظام اپنا کلام رشید کو پڑھنے کیلیے عنایت فرماتے ہیں۔

سنہ ۱۳۲۶و۲۷ھ میں حضور نے کسی مجلس میں شرکت نہیں فرمائی۔ سنہ ۱۳۲۸ھ میں چودہ مجلسوں میں تشریف لائے۔ اپنی بہت سی رباعیاں اور چودہ سلام رشید کو مرحمت فرمائیں اور ارشاد ہوا کہ آپ ایک یا دو رباعیاں اور ایک سلام روزانہ پہلے ممبر پر پڑھیے اور اُس کے بعد مرثیہ شروع کیجیے۔ چنانچہ جناب رشید نے مطابق حکم عالی عمل کیا +

(مندرجہ رباعیاں اور سلام جناب رشید نے ایک مجلس میں پڑھے تھے کہ نقل کر لی گئیں)

پہلے روز جب جناب رشید کو یہ رباعیاں اور سلام مرحمت ہوئے تھے۔ تو اُنھوں نے پہلے اپنی یہ رباعی پڑھ کے اُس کے بعد حضور نظام کی رباعیاں اور سلام پڑھا تھا۔ وہ یہ ہے

رباعی

رفعت سے کیے پیام مجھ کو رفعت نے دیے
پیغام تمام مجھ کو عزت نے دیے
کیوں ہو نہ رشید اپنی توقیر پہ ناز
پڑھنے کو سلام مجھ کو حضرت نے دیے

ایک دوسری مجلس میں کلام فصاحت نظام کے پہلے رشید نے یہ رباعی پڑھی

رباعی

اعلیحضرت کو داد کیا دی جائے
یہ نظم اچھی نظر سے دیکھی جائے
قرآن حق کا۔ یہ ظل حق کا ہے کلام
بعد اُس کے تلاوت اس کی بھی کیجائے

کئی رباعیاں حضور نظام نے ستائش رشید میں نظم فرمائی تھیں۔ اور پڑھنے کا حکم ہوا تھا۔ لہذا رشید نے جب اُن کو پڑھا۔ ہر ایک کے جواب میں ایک رباعی مدح نظام میں پہلے پڑھی لطف یہ ہے کہ رباعی میں رباعی کا جواب اور مدح نظام دونو چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) آصف

مداح امام دو جہاں ہیں یہ رشید
لاریب کہ اعجاز بیاں ہیں یہ رشید
پیری میں نیا رنگ سخن کا دیکھا
میں کیا کہوں؟ اللہ جواں ہیں یہ رشید

آداب شاہی بجا لا کر ممبر پر تشریف لے گئے۔ اور یہ رباعیاں پڑھیں +

توصیف حیدرآباد		
	ماشاء اللہ ہے بہت خوب آباد	خوش وضع آباد۔ ہے خوش اسلوب آباد
	حضرت کے قدم سے پائی ہے یہ صورت	حیدرآباد اب ہے محبوب آباد
	طالع جو بلندی پہ ہمارے آئے	مہتاب کے ساتھ ماہ پارے آئے
	ہیں جلوہ فگن شاہ بھی شہزادے بھی	خورشید کے ہمراہ ستارے آئے

تیسرے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور عثمان علی خاں بالقابہ بھی بزمانہ ولیعہدی اپنے والد ماجد کے ہمراہ تشریف لائے تھے، اس رباعی کے بعد ایک سلام پڑھا۔ اور مرثیہ شروع کر دیا۔ مگر یہ لحاظ رکھا کہ طول سخن حضور کی خاطرِ نازک پر بار نہو۔ جا بجا عرض کرتے تھے ”حضور بس“، مگر حضور فرماتے تھے ”اور پڑھیے“۔ بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ رشید کا کلام جادو کا اثر کر رہا ہے۔ اور کیوں نہ اثر کرتا۔ حضور نظام خود روزمرہ کہتے تھے۔ دوسرے نواب مرزا خاں داغ مغفور کے کلام کو خلعتِ حسنِ قبول عطا فرما چکے تھے۔ جو دہلی کے روزمرہ کی جان تھا۔ یہاں بھی مرثیہ کی یہی کیفیت تھی۔ کہ گویا گلزار لکھنؤ کا ایک بلبل چہک رہا تھا نہ کہیں الفاظ ثقیل نہ کہیں مطالب دقیق۔ بندش سادہ۔ الفاظ نرم و مناسب محل، یہی سب باتیں تھیں جو حضور نظام کی شاہانہ آواز کو دادِ سخن کے لیے بار بار بلند کرا دیتی تھیں۔ اور یہ میدان مرثیہ گوئی کا کہنہ مشق و شیریں زبان پیر جھک جھک کر آداب بجا لاتا تھا +

مرثیہ اپنی پوری روانی دکھا رہا تھا۔ ذاکر کا دل ہاتھوں بڑھا رہا تھا۔ حتیٰ کہ تقریباً دو گھنٹہ کی شرکت کے بعد حضور نظام رشید کو خلعت تحسین آخری دے کر دولت سرا تشریف لے گئے۔ اور اسی سال صرف ایک ہی مجلس میں شریک ہوئے۔ مگر دوسرے سال پانچ مجلسوں میں شرکت فرمائی۔ حضور نظام کی شرکت کی وجہ سے مجلس میں مجمع کی

بنا بریں دوسرے سال حضورِ نظام حسبِ وعدہ تشریف لائے۔ اور مجلسِ حسینؑ کو زینت بخشی +

شانِ امامت اور شوکتِ دنیوی

یہ اُس حسینؑ غریب کی مجلسِ عزا ہے جس میں شاہانِ اولوالعزم نے بارہا اپنی شان و شوکتِ ظاہری کو تھوڑی دیر کے لیے طاقِ نسیان کی نذر کر دیا ہے۔ اُس کربلا کے مسافر کی مصیبت کوئی معمولی مصیبت نہ تھی۔ گدا و بادشاہ دونوں کے جذباتِ الم اُس واقعۂ جاں گزا کے ذکر سے یکساں حرکت میں آتے ہیں۔ اور آخر کو منوا لیتے ہیں کہ اُس قبلۂ بنی ہاشم کے مجبور شہزادہ نے اپنے بشیر و نذیر نانا کی اُمت کی مغفرت کے لیے دُنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا نہایت خندہ پیشانی سے کیا۔ کیا اُس کے عوض میں مذہبِ اسلام کے ذی وقار نفوس اتنا بھی نہ کرتے کہ اپنی دُنیاوی نگاہ میں آدابِ امامت کو ملحوظ رکھ کے تھوڑی دیر کے لیے اظہارِ عزت و احتشام کو ملتوی رکھتے اور رسول اللہ کو خوش کرتے +

حضورِ نظام مبرور اور خلوصِ شرکتِ مجالس

حضورِ نظام کو اگرچہ مذہبِ تشیع سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر جانتے تھے کہ یہ مجالس رسول اللہ کے نواسہ کا غم یاد دلانے کے لیے برپا کی جاتی ہیں۔ جن میں لحاظِ ادب بھی ایک وقیع اجر رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضورِ عالی جب فیاض علی خاں بہادر کے یہاں مجلس میں تشریف لائے تھے۔ تو مسند تکیہ ہٹوا دیا تھا۔ اور اُسی فرش پر تشریف فرما ہوئے تھے جس پر عوام بیٹھے تھے +

نواب بہرام الدولہ بہادر کے یہاں بھی حضورِ عالی کے لیے مسند تکیہ نہیں بچھایا گیا + حضورِ نظام منبر سے کچھ فاصلہ پر دو زانو تشریف فرما ہوئے + زیادہ قابلِ ذکر یہ امر ہے کہ باوجود ایسی شدید گرمی کے کہ پسینہ میں تر بتر ہو گئے تھے۔ اپنے پنکھے کو رکوا دیا۔ اور دوسرے شرکاء مجلس کو برابر پنکھا جھلا گیا +

جنابِ رشید کو بھی اپنا کلام پیشکش سمع ہمایوں کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔

اور اُس کے بعد ہر مجلس میں پانچ ہزار سے کسی طرح کم نہوتے تھے۔ یہ مجمع اگرچہ بادی النظر میں مبالغہ کی حد تک پہنچتا ہی۔ مگر حیدر آباد سے شہر اور رشید سے ذاکر کے لیے چنداں زیادہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ رشید کا رنگِ سخن اپنے نانا انیس کے اتباع میں صاف اور عام فہم ہی، جائے تعجب نہیں اگر رشید کے کلام کو مرجعیت عام حاصل ہوئی +

سر سالار جنگ بہادر مرحوم کا بنا کردہ ایک نہایت وسیع مکان ہی جو شادی خانہ کے نام سے موسوم ہی۔ اُس میں مجالس ہوا کرتی تھیں۔ کسی دوسری جگہ اتنا وسیع مجمع نہیں آسکتا تھا۔ علاوہ دیگر معززین شہر اور اراکین سلطنت کے حضرات ذیل کی شرکت قابل ذکر و باعث وقار مجلس ہی: عماد السلطنت نواب لائق علی خاں بہادر = منیر الملک نواب سخاوت علی خاں بہادر = نواب خانخاناں بہادر = نواب فخر الملک بہادر = مہاراجہ کشن پرشاد = شاد وزیر اعظم = نواب تہور جنگ بہادر = نواب محبوب یار جنگ بہادر = جناب مولوی افضل حسین صاحب چیف جسٹس =

مجلس میں حضور نظام کی شرکت۔

جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوج خلف جناب مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہٗ جناب کیامن علی خاں صاحب بہادر کے یہاں مجلس پڑھتے تھے۔ غالباً ۱۳۲۳ھ میں حضور نظام مبرور مجلس میں تشریف لائے۔ اور جناب اوج مغفور کو سُنا۔ بعد ختم مجلس دریافت فرمایا " کوئی اور مرثیہ خواں ہیں " حاشیہ نشینان مسندِ شاہی نے دست بستہ عرض کی " ظل اللہ۔ انیس مغفور کے نواسہ جناب پیارے صاحب رشید بہرام الدولہ کے یہاں مجلس پڑھتے ہیں " نواب بہرام الدولہ بہادر کو شرکتِ مجلس کے لیے عرض کرنے کا اتفاق سے ایک بیش بہا موقعہ مل گیا۔ اُنھوں نے حضور شاہی میں عرضداشت کی کہ جناب رشید میرے یہاں مجلس پڑھتے ہیں۔ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را۔ حکم ہوا کہ مابدولت رونق افروز مجلس ہونگے +

جنابِ نفیس مغفور بھی فروکش ہوتے تھے +

جنابِ رشید فرماتے تھے کہ کھانا بہت نفیس آتا تھا۔ جس میں یہ چیزیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور جن کی لطافت طعم کا اکثر ذکر کرتے تھے +

چگر = املی کی نئی کوپل اور قیمہ۔

مُبلتی = دہی چاول (حیدرآباد میں برائے فاقہ شکنی محرم میں استعمال ہوتا ہے)

بودن بودی = نہایت لذیذ مزہ میں مثل جوزی حلوا سوہن کے۔

دھی پکھار املوا =

باقلہ کی لوز = میوے کی مٹھائی =

پہلی مرتبہ جنابِ رشید محرم میں تشریف لے گئے تھے۔ اور دوسرے سال سے چہلم کے زمانہ میں جایا کرتے تھے۔ اُن کے کمال نے پہلے ہی سال منوا دیا۔ کہ نفیس کے بعد اگر کسی کو حیدرآباد میں مقبولیت عام ہو سکتی ہے تو رشید کو +

نواب صاحب کی قدر شناسی

عالی جناب نواب بہرام الدولہ بہادر نے بھی قدرِ کمال کماحقہٗ کی۔ اور اب دوسرے سال جو جنابِ رشید تشریف لے گئے تو بجائے لکڑکوٹ باغ کے نواب صاحب کی خاص کوٹھی واقع نظام باغ میں قیام کا بندوبست کیا گیا +

رشید ہمیشہ نواب صاحب موصوف کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ میری عزت افزائی اور قدر سخن جیسی فرمائی ہے۔ میں اُس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ واقعی اُنھوں نے اپنے احسانات کو رشید کی زندگی ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ اُن کے بعد بھی اُن کے پس ماندوں کے کفیل ہوئے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیعُ اَجرَ المُحسِنِینَ

شرکائے مجلس اور دعوتِ رشید

بقول رشید پہلی مجلس میں تقریباً سات ہزار آدمیوں کا اندازہ کیا گیا تھا

بلانے سے کبھی نہ آئیں گے۔ جب تک میں اُن کے لیے خاص کوشش نہ کرونگا۔ چنانچہ میر صاحب موصوف سے اور حکیم میر باقر حسین صاحب مغفور سے جو لکھنؤ کے ممتاز اطبا میں سے تھے۔ باہم دوستانہ مراسم تھے۔ لہذا اُنھوں نے حکیم صاحب کے پاس خط بھیجا اور اُن سے سفارش چاہی کہ وہ جناب رشید کے پاس بذاتِ خود جائیں اور اُن کو سفر حیدر آباد کے لیے مجبور کریں۔ حکیم صاحب چونکہ جناب رشید کے ساتھ کے پڑھے ہوئے تھے اور بے تکلف دوست تھے۔ اس لیے بادشاہ علی صاحب کی تحریر کے مطابق فوراً رکاب گنج تشریف لائے اور جناب رشید سے کہا۔ دیکھو بھائی میں تمہارے پاس آیا ہوں اب تمکو حیدر آباد ضرور جانا ہوگا۔ اگر اب انکار کروگے تو میرے رنج کا باعث ہوگا۔ جناب مولوی محمد حسین صاحب قبلہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ اُن کی مزید تائید نے جناب رشید کے لیے انکار کی گنجائش نہ رکھی۔ صرف استخارہ کی بنا ٹھیری۔ اور جناب مولانا کی مقدس تسبیح کے ذریعہ سے مصلحت خدا نے بھی موافقت کی۔ دوسرے روز حکیم صاحب نے میر بادشاہ علی صاحب کو لکھدیا کہ رشید تشریف لائیں گے طلب کا تار اور مصارف سفر بھیجدیجیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تار اور دوسو روپیہ آئے جناب رشید لکھنؤ سے حیدر آباد پہنچے۔ اسٹیشن پر نواب بہرام الدولہ بہادر کے فرزند ارجمند نواب زین العابدین صاحب بہادر۔ اور میر بادشاہ علی صاحب مع چند دوسرے رفقا کے موجود تھے۔ جناب رشید ریل سے اُترے۔ نواب صاحب کے صاحبزادہ نے استقبال کیا۔ اور اسٹیشن کے باہر فٹن تک ساتھ ساتھ تشریف لاکے سوار کرادیا۔ جناب رشید فٹن میں سوار ہوکر بارہ دری سالار جنگ بہادر واقع لکڑ کوٹ باغ میں پہنچے۔ جہاں اُن کے لیے سامان آسائش فراہم کردیا گیا تھا۔ اسی بارہ دری میں

وہاں جانے سے انکار کیا۔ اسی سلسلہ میں ایک روز جناب مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ مغفور
نے مؤلف سے ایک روز فرمایا۔ کہ جناب رشید سے اور مجھ سے جو دوستانہ تعلقات ہیں
اُن کو کوئی دوسرا سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہر امر میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ دُنیا اِدھر کی اُدھر
ہوجائے مگر میرا کہا نہیں ٹالتے مگر ایک موقع پر مجھ کو بڑا تعجب ہوا۔ جبکہ جناب رشید
کے پاس دوسرا طلبی کا تار آیا تھا۔ وہ تار لیے ہوئے فوراً میرے پاس آئے اور مجھ سے
استشارہ کیا۔ میں نے اُن کے اخراجات کی زیادتی اور ذرائع آمدنی کی کمی پر نظر کرتے
ہوئے مشورہ دیا کہ فوراً چلے جائیے۔ جناب رشید سے اور مجھ سے اس پر ایک طویل
گفتگو ہوئی۔ وہ کہتے تھے اگر میں وہاں گیا تو ممکن ہے کہ کچھ خاندانی رنجشوں کا باعث ہو۔
میں کہتا تھا کہ آپ کو صاحب مجلس خود باصرار بلا رہے ہیں۔ کسی کو شکایت کی گنجائش ہی
نہیں۔ خلاصہ یہ کہ نہ جانا تھا نہ گئے۔

دوسروں کے جذبات کا لحاظ

جناب رشید چونکہ مرنجاں و مرنج مزاج کے بزرگ تھے۔ اُن کو خیال آیا
کہ اگر میں نواب بہرام الدولہ کے یہاں جانے لگا تو بہت ممکن ہے کہ وہ دوسرے ذاکرین
میں سے کسی کی کمی کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جناب علی محمد صاحب عارف ہی ہوں۔ بے شک
یہی مصلحت تھی اور کچھ نہ تھا۔ ورنہ رشید کے لیے وہ وقت آزمائشی تھا۔ روزانہ
قرضدار ہوتے چلے جاتے تھے۔ وہ اعزا سے اوّل تو بہت کم ملتے تھے۔ اور اگر ملتے
بھی تھے تو ہمیشہ یہ خیال رکھتا تھا۔ کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جائے جس سے باہم دلوں میں
کسی قسم کا رنج پیدا ہوجائے۔ حتّٰی کہ اپنی زندگی کی آخری ساعت تک اُنھوں نے اس امر کو ملحوظ رکھا۔

سفر حیدرآباد اور جناب رشید

بہر حال جب نواب مذکور کی متواتر تین سال کی طلب پر بھی رشید نہ گئے
تو اُن کے معتمد میر پادشاہ علی صاحب ضیا مرحوم نے عرض کی۔ حضور وہ اس طرح

اور وقت پر خود جناب بنّن صاحب کو منتخب کیا کہ لکھنؤ جائے جناب رشید کو لائیں چنانچہ اس سال بنّن صاحب لکھنؤ آئے اور جناب رشید کو باصرار لے گئے۔ باؤنی کے امام باڑہ میں مجلسیں ہوئیں۔ یہ وہی امام باڑہ ہے جس میں انیس کے آیات کمال کا اظہار ہو چکا ہے۔ میر نواب صاحب مونس۔ دمیر بادی صاحب وحید جس میں برسوں پڑھے ہیں۔ رشید کے لیے اُس ممبر پر پڑھنا باعث فخر تھا۔ جو اُن کے جد کامل انیس کا قدم آشنا تھا +

جب رشید پہنچے مجلس منعقد ہوئی۔ سارا عظیم آباد جمع ہو گیا۔ خود فرماتے تھے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ جن میں اہل ہنود پانسو سے کم تعداد میں نہ ہوتے تھے۔ رشید وہاں ایک عشرہ پڑھتے تھے۔ دو بجے مجلس شروع ہوتی تھی اور چار بجے ختم ہوتی تھی۔ سامعین اس قدر محظوظ ہوتے تھے۔ کہ مرثیہ کہیں سے چھوڑنے نہیں دیتے تھے۔ بعد مجالس نواب صاحب ساڑھے سات سو روپیہ دیتے تھے۔ اور بہت اعزاز و اکرام فرماتے تھے + رشید نے انتقال کے دو سال قبل عظیم آباد جانا خود ترک کر دیا تھا۔ وجہ عذر پیری۔

رشید حیدرآباد میں

عالی جناب نواب بہرام الدولہ بہادر کے یہاں حیدرآباد میں بڑی بڑی نامی مجلسیں ہوتی تھیں اور ہوتی ہیں۔ ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کے نامی ذاکر بیشتر یہیں آئے اور آتے ہیں نفیس مرحوم کے بعد جناب عارف مرحوم نے اپنے کامل نانا کی جگہ لی۔ اور ہر سال جانے لگے۔ وہاں کے نکتہ رس حضرات نے جناب نواب مذکور سے جناب رشید کے سننے کا شوق ظاہر کیا۔ لہذا تحریک طلب کی گئی۔ مگر تحریری جس کا کوئی نتیجہ نہوا۔ دو سال برابر جناب رشید کے نام تار آیا۔ مگر انھوں نے باوجود تنگی معاش

عطائے خلعت

چنانچہ حسبِ وعدہ جنابِ رشیدؔ ہر سال تشریف لیجایا کیے۔ نواب صاحب کے با اختیار ہونے پر بھی دو سال تشریف لے گئے ہیں۔ پہلے سال جب برائے حصول رخصت جنابِ رشیدؔ مچھی بھون میں تشریف لے گئے تو نواب صاحب نہر میں حمام کر رہے تھے اطلاع ہوئی بلا لیا۔ باتیں کرتے رہے۔ اور جب حمام سے فارغ ہوئے دربار میں تشریف لائے اور حکم دیا۔ کہ ایک خلعت مع شالی رومال جنابِ رشیدؔ کو عطا ہو۔ عطائے خلعت رشیدؔ کے لیے مخصوص تھی۔ ورنہ رامپور میں خلعت دینے کا رواج نہ تھا۔ نہ ہی جنابِ رشیدؔ کو ہر سال تین سو پچیس روپیہ ماہانہ ملتے تھے۔ ایک سال نواب صاحب کو رشیدؔ کا کلام بہت پسند آیا۔ وقتِ ملاقات جوشِ مرحمت میں فرمایا "جب میں با اختیار ہونگا تو بہت کچھ دونگا" ایک سال ریاست سے طلب کا تار نہ آیا لہذا پھر نہ گئے +

رشیدؔ عظیم آباد میں

عظیم آباد میں شیعوں کی بیشتر تعداد انیسؔ کے ماننے والوں کی ہے۔ اور خود انیسؔ مرحوم نے وہاں بڑے بڑے معرکہ کی مجالس پڑھی ہیں۔ دبیرؔ کے شیدائی بھی ہیں مگر مقابلتاً کم + یہ ابتدا ہی سے مشہور تھا کہ رشیدؔ اپنے نانا انیسؔ کی زبان کہتے ہیں۔ لہذا وہاں کے لوگوں میں جیسا اشتیاق پیدا ہو سکتا ہے ظاہر ہے + اس بنا پر رؤسائے شہر سے لوگوں نے خواہشیں کرنی شروع کیں کہ جنابِ رشیدؔ بلائے جائیں۔ چنانچہ جناب چھوٹے نواب صاحب برادرِ خرد جناب پادشاہ نواب صاحب نے اپنے ملازمین مع خطوط طلب روانہ کیے۔ مگر جنابِ رشیدؔ نے انکار کیا۔ بالآخر شاید ۱۳۲۰ھ میں رشیدؔ کے ایک دوست جناب بین صاحب رشیدؔ کو لے گئے اور اپنے یہاں ایک مجلس پڑھوائی بعد ختم مجلس نواب صاحب مذکور نے بذریعہ رفقا رشیدؔ سے وعدۂ مجالس لینا چاہا انھوں نے فرمایا "انشاء اللہ" نواب صاحب کو اس جملۂ شرطیہ انشائیہ سے اطمینان نہوا

اب نہیں پایا جاتا۔ صرف چند گذشتہ والیان ریاست کی قبریں جالی دار چوکھٹے میں ڈھکی نظر آتی ہیں + نواب حامد علی خاں صاحب بہادر نے مچھی بھون کے جانب جنوب ایک خوشنما امام باڑہ معہ ایک مختصر مسجد کے تعمیر کرایا ہے۔ اس میں معہ شاہ نشین تین درجے ہیں۔ سب سے آخر یعنی شاہ نشین پر چاندی کی ایک بڑی اور خوشنما ضریح رکھی ہے اور اس پر سبز مخمل کا کار چوبی شامیانہ نصب ہے۔ ماہ محرم میں اس ضریح کے دونو طرف دوسری ضریحیں اور علم رکھے جاتے ہیں۔ بیچ کے درجہ میں ایک بڑا چاندی کا ممبر ہے اسی درجہ میں شاہ نشین کے متصل نواب صاحب سیاہ مسند پر ماہ محرم میں تشریف فرما ہوکر شریک مجلس ہوتے ہیں +

امام باڑہ کے آگے ایک وسیع چبوترہ ہے جس کا مغرب و جنوب مسجد کے صحن سے ملتا ہے +

المختصر جناب رشید نے مجالس پڑھنا شروع کیں۔ پہلی مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا۔

دفنِ علی اصغر سے جو فرصت ہوئی شہ کو

چھ سات سو آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ جس میں بیشتر اراکین ریاست ہوتے تھے +

نواب صاحب کی سخن سنجی

جناب رشید نواب صاحب کی نکتہ رس طبیعت کی تعریف فرماتے تھے اور تعجباً کہتے تھے کہ سرکار ایسی برمحل داد دیتے تھے کہ مجھ کو حیرت ہوتی تھی +

ایک روز جناب رشید مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ اثناء خواندگی میں۔ نواب صاحب نے فرمایا "آپ کو ہمیشہ تکلیف کرنی ہوگی" جناب رشید نے عرض کی "حضور دیکھا جائے گا" نواب صاحب نے پھر فرمایا "نہیں وعدہ کیجیے" اب کی جناب رشید کے الفاظ تھے "حضور جلیا حکم ہوگا" سہ بارہ نواب صاحب نے فرمایا "آپ وعدہ کیجیے" جناب رشید نے عرض کی "بہت خوب"

رشید رامپور میں

وہ وقت ہے کہ نواب مشتاق علی خاں بہادر کا مرحوم کا انتقال ہو چکا ہے اور جنرل اعظم الدین خاں کا دور دورہ ہے۔ موجودہ نواب عالی وقار نابالغ ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے جنرل مذکور انتظام ریاست کے لیے مقرر ہوئے ہیں +

نواب صفدر علی خاں صاحب مرحوم خلف نواب محمد سعید خاں بہادر۔ نواب کلب علیخاں (خلد آشیاں) کے چچا تھے۔ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے۔ اور مجالس محرم اور تعزیہ داری کی رسم رامپور میں ادا کرتے تھے +

جب ۱۸۸۷ء میں نواب مشتاق علی خاں صاحب بہادر تخت نشین ہوئے تو اُنھوں نے اپنے اجداد کے بنا کردہ امام باڑہ کو پھر ذکر حسین سے آباد کیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اُن مرحوم کے بعد بھی جنابِ عالیہ مغفورہ کے اثر سے ریاست کے امام باڑہ میں محرم کی مجالس برابر ہوتی رہیں۔ چنانچہ تقریباً ۱۸۹۴ء ۱۳۱۲ھ میں نواب صفدر علی خاں صاحب مرحوم کی تحریک سے جنرل مذکور نے جنابِ رشید کو مجلسِ محرم پڑھنے کے لیے طلب کیا +

ریاست کی طرف سے جنابِ رشید کی بہت خاطر مدارات ہوئی۔ دونو وقت خاصہ کا کھانا اور اشیاء ضروری بھی بافراط مہیا رہتے تھے +

نواب رامپور اور جناب رشید

اُس وقت عالی جناب نواب حامد علی خاں بہادر بالقابہ بغرض تبدیل آب و ہوا نینی تال پر رونق افروز تھے۔ صرف جناب رشید کو سُننے رامپور تشریف لائے۔ جس کا اظہار خود وقت ملاقات فرمایا۔ یعنی نواب صاحب نے جنابِ رشید سے فرمایا "میں آپ کو سُننے کے لیے پہاڑ سے آیا ہوں"۔ جنابِ رشید نے جواب میں عرض کیا "عنایت۔ قدردانی"

اُس وقت یہ وسیع قلعہ نہ تھا۔ بلکہ طرز قدیم کے موافق ایک چار دیواری تھی۔ اور بڑے دروازہ پر ایک توپ لگی رہتی تھی۔ اس دروازہ کے قریب پُرانا امام باڑہ تھا جس کا نشان

اپنی آئندہ زندگی کمال کی بدولت آرام و آسائش سے گذاری + رہے آتش مرحوم وہ ہمیشہ کے مست خیال تھے۔ کبھی دولت کی پروا کی ہوتی تو یہ روپیہ بھی رہتا۔ ایک ہی سال میں کھا کھلا کے بیٹھ رہے۔ اور پھر وہی مفلس آتش ہو گئے۔ خواجہ سعدی کے قول کو قوی کیا۔ ایک شاعر نے کہا دوسرے نے عملاً دُنیا کو دکھا دیا کہ ؎

نیم نانے گر خورد مرد خدا　　　بذل درویشاں کند نیمے دگر

ترک وطن و اہل کمال

وہ زمانہ آ گیا تھا کہ انیس ایسا مستغنی المزاج بھی ایک دفعہ لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اگرچہ ضیافت کرنے والوں نے قدر شناسی اور عزت کمال میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر پھر بھی لکھنؤ کی گری ہوئی ہوا انیس کو جلد سے جلد حیدرآباد سے اپنے مرکز پر کھینچ لائی +

یہ ضرور ہے کہ اہل کمال کو ہوس زر سے مستغنی ہو جانا چاہیے۔ مگر ضرورت زمانہ کسب معاش۔ پرورش عیال۔ ترک وطن پر مجبور ہی کر دیتے ہیں۔ لکھنؤ کی خاک اب بھی اہل کمال کے پیدا کرنے میں قاصر نہیں۔ مگر اس دور ناگوار سے مجبور ہو کر اُن کی وقتی جدائی گوارا کر لیتی ہے +

رشید کا نقد کمال جب لکھنؤ کی کسوٹی پر ایک نمایاں رنگ دینے لگا۔ تو ہندوستان کے شیعی حلقوں میں اُن کے کلام کے سُننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اور خود رشید کے ضروریات زندگی بھی کثرت تعلقات سے وسیع ہوتے گئے۔ پہلے جو حضرات لکھنؤ کے باہر رشید کے کلام کے مشتاق ہوئے وہ دو بزرگ نواب صفدر حسین خاں صاحب اور نواب ترصد حسین خاں صاحب شیخ پور حسین آباد کے تھے۔ ان حضرات کے یہاں رشید مدت تک جاتے رہے +

کس طرح دل جان زہرا سے سنبھالا جائیگا ۔ تیر کیونکر حلقِ اصغر سے نکالا جائے گا

یہ سمجھ کر رہ گئے ہمراہ اصغر کو حسینؑ ۔ قید میں بانو سے یہ بچہ نہ پالا جائے گا

روکیا اکبر کو تم زینب سے کہتے تھے حسین ۔ اذن اگر مانگا بہن مجھ سے نہ ٹالا جائے گا

جب وصیت کرکے شہ سر کے کہا سجادؑ نے ۔ مجھ سے یہ بچوں کا گھر کیونکر سنبھالا جائے گا

کہتے تھے سب بنتا تھا عابد کا جب طوقِ گراں ۔ ہائے یہ گردن میں کس بیکس کی ڈالا جائے گا

رو کے فرماتی تھیں زہرا گود میں تھے جو حسینؑ ۔ میرے بچہ بے خطا تو مار ڈالا جائے گا

کہتے تھے عابد مٹے تلووں کے سارے آبلے ۔ پر قیامت تک نہ دل کا کوئی چھالا جائے گا

شور ہی چلّو میں شمر لیتے ہیں اصغر کا لہو ۔ حشر آجائے گا جب یہ خوں اچھالا جائے گا

مرثیے جائیں گے ہم قبر میں بھی اے رشید ۔ یہ ہمارے ساتھ جنت کا قبالا جائے گا

رشید شیخ پور میں۔

غدر کے بعد سے لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا جس کی ہوائیں اہلِ کمال کا طواف کرتی تھیں اور اُن کو اپنے آغوش سے جدا ہونے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے وہ اہلِ دولت جن کے قدر شناس ہاتھوں نے کمال کی مختلف تصویروں پر زریں نچھاوریں کیں تھیں۔ آج اپنے سینوں پر خالی ہاتھ رکھے لکھنؤ کے ویران و بے نشان قبرستانوں میں آرام کر رہے ہیں۔ اور اپنی بے بسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے گذرنے والوں کو کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَان کا زبردست حکم یاد دلاتے ہیں +

لکھنؤ کا گیا گذرا زمانہ تھا۔ اور کمال کا وداعی وقت تھا۔ مگر پھر بھی آتش و ناسخ کو معتمد الدولہ بہادر نے ایک معتدبہ یکمشت رقم دیکر کہا کہ میرا اب وہ زمانہ نہیں ہے جو آپ لوگوں کی خدمت میں ماہانہ پیشکش کیا کروں۔ لہذا یہ رقم یکمشت قبول فرمایئے۔ ناسخ مغفور چونکہ ایک تاجر کے فرزند تھے۔ اُنھوں نے روپیہ کی قدر کی۔ اور ہرن کی سرائے میں دکانیں اور مکانات خرید کے

زخم کھاتے ہی علی اصغر کرینگے انتقال تیر مرغِ روح کو گویا پرِ پرواز ہی
مرنے جاتے ہیں علی اکبر جوانی ہی شروع عمر کا انجام ہی اور سبزہ کا آغاز ہی
جو کہوں گا تو کرے گا دمبدم کہتے تھے شاہ اے مرے مالک مجھے رحمت پہ تیری ناز ہی
یادِ اصغر بھی ہی شہ کو زخم کھانے کا بھی شوق دل لیئے جاتی ہی ایسی تیر کی آواز ہی

روکتا کون اہلِ کیں کو ایک بھی یاور نہ تھا لوٹنے جب آئے تھے ظالم کوئی در پر نہ تھا
چین کیا پاتے حرم زنداں کچھ اپنا گھر نہ تھا اونچی نیچی تھی زمیں تکیہ نہ تھا بستر نہ تھا
کس سے پوچھوں طشت میں کھاّ گیا کیوں زیرِ تحت زانوئے زہرا پہ جو رہتا تھا یہ وہ سر نہ تھا
کربلا تک لے گئی تہیں پھر کے جب پہنچیں وطن ماں کے ساتھ اکبر نہ تھے اور گود میں اصغر نہ تھا
بعد قتلِ شاہِ دیں ہر ایک کا تھا دل لہو جس کے نیچے خوں نہو ایسا کوئی پتھر نہ تھا
جنگلوں میں روز و شب پھر پھر کے کہتے تھے حرم یوں ہوئے بے گھر کبھی جیسے ہمارا گھر نہ تھا
کٹ گیا سر شہ کا ڈوبی کشتیِ آلِ رسول ناخدا بیچارہ تھا بیمار اور لنگر نہ تھا
پوچھ کے رضوان سے کیوں جاتا جناں ہی رشید واہ وا کیا ہیں غلامِ حضرتِ قنبر نہ تھا

خوشی سے زخم کھانے یوں شہِ دلگیر آتے ہیں کہ بڑھ جاتا ہی دل جب سامنے سے تیر آتے ہیں
نکل آئی ہیں حوریں کوثر و تسنیم سے باہر خبر پہنچی ہی پیاسے حضرتِ شبیر آتے ہیں
لسپر کے بعد جب کر ڈکیں کمانیں شہ نے فرمایا علی اصغر گئے دنیا سے اب کیوں تیر آتے ہیں
گئے ہیں شاہِ دیں لے کر کھڑی ہیں منتظر بانو بیاں ہی دیکھیے کب اصغرِ بے شیر آتے ہیں
نہ نکلے اس سے بھی نالہ یہ ہی منظور عابد کو فقط اس واسطے تھامے ہوتے زنجیر آتے ہیں

گرے ہیں رن میں اکبر دوڑتے ہیں ہمت بڑھے اعدا
مٹانے کو رسول اللہ کی تصویر آتے ہیں

پیری اور احباب سے جدائی	پیری وہ ہی کہ جس کا مارا ہوں میں چھپ جاؤں نظر سے ہی وہ ہنگام قریب	اے بھائیو مہمان تمہارا ہوں میں وقت اور ہی اب صبح کا تارا ہوں میں
پیری اور تجربۂ دنیا	دیکھی بس سب کی مہربانی ہم نے رکھا نہ وہ دل جس میں تھیں لاکھوں باتیں	سُن لی اک اک کی لن ترانی ہم نے طے کر دیا قصۂ جوانی ہم نے
انقلاب	ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری	کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا پیری کہتی ہی خواب دیکھا ہوگا
یاد جوانی	کیوں جا کے سوئے عالمِ فانی آتی کہتا جب میں ذرا دکھا دے صورت	مغرور اگر تھی نہ جوانی آتی اے کاش صدائے لن ترانی آتی

سلاموں کا انتخاب

ہیں بر میں صبر گوشۂ خوشخو لیے ہوئے
جاتا ہی دل کو تیر سہ پہلو لیے ہوئے

کہتے ہیں شاہ لیتے ہیں اکبر جو کروٹیں
اُمت کی بھی نجات کا پہلو لیے ہوئے

جنسِ ثواب بکتی ہی میدانِ حشر میں
ہم بھی کھڑے ہیں تھوڑے سے آنسو لیے ہوئے

میرے گناہ تولتی ہی رحمتِ خدا
قدسی الگ کھڑے ہیں ترازو لیے ہوئے

اُس فوج سے نہ کیوں دلِ شبیر ہو قوی
جس کا نشاں ہو قوتِ بازو لیے ہوئے

خیمہ سے لاش لے چلے اکبر کی جب حسینؑ
ماں در تک آئی ہاتھوں پہ گیسو لیے ہوئے

طوقِ آہن عابدِ دلگیر کا دمسازہ ہی
خیر مقدم خانۂ زنجیر میں آوازہ ہی

ایک معصومہ کی عصمت جلوہ فرما ہی جہاں
حضرت مریمؑ کی عصمت فرشِ پا انداز ہی

شہ نے اتنے زخم کھائے اس میں کتنے رہ گئے
دل کے سو ٹکڑے ہیں ہر ٹکڑے میں اک اک تازہ ہی

عنوان		
یادِ جوانی	پیری سے خاک مہربانی نہوئی یوں توڑتا دم کہ دیکھنے لوگ آتے	وقتِ آخر بھی کامرانی نہوئی افسوس کہ اس وقت جوانی نہوئی
پیری اور زینتِ باطل	پیری میں رشید یہ بدآئینی ہے آئینہ بھی دیکھتے ہو ماشاءاللہ	بالوں میں خضاب طرفہ رنگینی ہے اب تک تم کو خیال خودبینی ہے
آخری وقت کی ذمہ داریاں	کیا بات ہے کس خوف سے تھراتا ہوں پیری تو جوانی سے گراں قدر نہیں	کچھ قوت وطاقت میں کمی پاتا ہوں کیا بوجھ پڑا ہے کہ جھکا جاتا ہوں
جوانی سے یاس	پیری کیا موت کی نشانی پہنچی رستہ میں بھی ملنے کی توقع نہ رہی	نزدیک اب مرگِ ناگہانی پہنچی ہم اب چلے جب دَورِ جوانی پہنچی
پیری اور ضعفِ بصر	طفلی تو گئی دور اُسے کیا جانیں ہم پیری نے یہ حال کر دیا آنکھوں کا	پائیں نہ کہیں خاک بھی گر چھانیں ہم ملجائے جوانی تو نہ پہچانیں ہم
گناہوں سے بریت کی شاعرانہ معذرت	ہیں یاد وہ دن نظر میں وہ راتیں ہیں تربت میں گنہ اپنے بیاں کرکے رشید	سمجھوں گا۔ مرے پاس بھی کچھ گھاتیں ہیں کہدوں گا۔ جوانی کی یہ سب باتیں ہیں
پیری اور تخفیفِ تکلیف	پیری میں عبادت کی کہاں طاقت ہے پیروں پہ خدا نے کی ہے تخفیف رشید	سچ پوچھتے ہو گر تو فقط ہمت ہے دیکھو کہ نمازِ صبح دو رکعت ہے
خمیدگی کمر اور افسوس	ملتے ہیں داغِ غم یہ گل چنتا ہوں ہر بار خمیدہ ہوتی جاتی ہے کمر	رعشۂ پیری سے کب ہے سر دھنتا ہوں جھک جھک کے صدائے آہِ دل سنتا ہوں
علاماتِ پیری	جھریاں وہ بلائیں جان پر آتی ہیں پیری کا بڑھا ہے زور کیا دیکھوں میں	یہ برچھیاں پتھر میں بھی در آتی ہیں آئینہ میں جھریاں نظر آتی ہیں

انتخاب رباعیات متعلق پیری

پیری و بیچارگی	دل کو سو سو طرح کے غم کھلانے دو جانے کا جوانی کے ہی غصہ بیکار	پیری جو رشید آئی ہی آنے دو دیکھو اپنی طرف بس اب جانے دو
آرام لحد اور مصرعۂ چہارم میں خوبی محاورہ	پیری سے ہیں خم راہِ جہاں کیونکر لیں لیٹے ہیں لحد میں اے فرشتو نہ ستاؤ	اک عمر پھرے ہیں دم ذرا دم بھر لیں چلتے ہیں ذرا کمر تو سیدھی کر لیں
جوانی کا غم	مدت سے جوانی کا الم باقی ہی یوں جھک کے جوانی سے ملا وقتِ وداع	اک عمر سے یہ نشانِ غم باقی ہی جب سے اب تک کمر میں خم باقی ہی
فلک شکایت	پیری میں خمیدہ کر دیا ہی تو نے سیدھا ہونے دے اب تو اے پیرِ فلک	ظالم کیسا ستم کیا ہی تو نے اپنا سا مجھے بنا لیا ہی تو نے
پیری اور ضعف	پیری نے جوانی کی جو دولت لے لی لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ	گویا مرے قتل کی اجازت لے لی ظالم نے توانائی و طاقت لے لی
اُمیدِ جنت	نامی ہوئے بے نشان ہونے کے لیے کی موت قبول خواہشِ جنت میں	افسانہ ہوئے بیان ہونے کے لیے ہم پیر ہوئے جوان ہونے کے لیے
خمیدگی کمر اور حُسن تعلیل	آخر ہوں دمِ فراغ پاتا ہوں میں پیری سے نہیں ہوں خم سفر ہی نزدیک	ہستی سے عدم کی سمت جاتا ہوں میں دل بیٹھ گیا جھک کے اُٹھاتا ہوں میں
پیری اور یادِ مرگ	بیتاب ہی یہ قلبِ حزیں اپنی طرف پیری میں جھکے جانے کا باعث یہ ہی	اور روح کو آرام نہیں اپنی طرف اب کھینچتی ہی ہمکو زمیں اپنی طرف

رباعیات و سلام

رباعی جس قدر صاف اور نصیحت آمیز کلام سے لا مال ہو اسی قدر اُس کی عمدگی ہی۔ خصوصاً چوتھے مصرعہ کو اس طرح صاف اور بے تکلف ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والے کے دل پر وہ مضمون اثر کر جائے جس کے لیے چار مصرعے کہے گئے ہوں۔ کیونکہ باقی تین مصرعے فقط چوتھے کے خیال کو پورا کرنے میں ممد ہوتے ہیں۔

شعرائے اُردو اور رباعی۔

جہاں تک دیکھا جاتا ہی اُردو شاعروں میں رباعی کے حق میں کوئی اتنا کامیاب نظر نہیں آتا جتنا مرثیہ گو حضرات + ظاہر وجہ یہ ہی کہ علاوہ مرثیہ گویوں کے دوسرے شاعروں نے رباعیات صرف تفنن طبع کی غرض سے کہیں کہ اُنھیں اس صنف سخن میں زمانہ معذور نہ سمجھے ورنہ رباعی کا مصرف اُن کے لیے مفقود ہی۔ ہر مشہور شاعر غزل گو نے رباعیاں کہیں مگر بہت کم +

لیکن خلیق۔ انیس۔ مونس۔ دبیر۔ عشق۔ تعشق۔ نفیس۔ رشید۔ عارف۔ اوج۔ یا اور دوسرے مرثیہ گویوں کے کلام میں رباعیات کا بھی کافی ذخیرہ ملتا ہی۔ یہ کیوں۔ یہ اس وجہ سے کہ مرثیہ گو جب نیا مرثیہ پڑھنے ممبر پر بیٹھتا ہی تو اُس کو ضرورت ہوتی ہی کہ سامعین کو مضامین مرثیہ سُننے کے لیے پہلے آمادہ کرلے۔ اور اسی کے بعد مرثیہ شروع کرے۔ کیونکہ اگر فوراً ہی بغیر رباعیات و سلام مرثیہ شروع کر دیا جائے تو سامعین کو متوجہ ہوتے ہوتے بہت سے اُن مصرعوں کا خون ہو جائے جو شاعر نے خون جگر صرف کر کے کہے ہیں۔ میری غرض یہ ہی کہ رباعیات و سلام مرثیہ کے لیے وہی کام دیتے ہیں جیسے ایک عمدہ نثر کا تمہیدی حصہ جو پڑھنے والے کو آنے والے مضامین کی اجمالاً خبر دیتا ہی اور اُس کے اشتیاق کو بڑھا دیتا ہی۔ رشید نے بہت رباعیاں کہیں۔ مگر اُن سب میں مضامین پیری کے متعلق جتنی ہیں اُتنی کسی دوسرے مضامین کی نہیں پائی جاتیں + ذیل میں رباعیات و سلام کا انتخاب درج ہی +

خوشی یہ آپ کے آنے کی ہے سارے زمانہ کو
کہ اب تو لوگ باتیں کرتے ہیں شہر خموشاں میں

بھلا یہ کون کہتا ہے کہ محتاجی کا عالم تھا
گُہر تم سے بھرے تھے حیدر صفدر کے داں میں

کیا ہے تم نے مداحوں کا سلطاں پاس بلوالو
قیامت ہے کہ میری قبر ہو گورِ غریباں میں

رشید آقا سے کہہ وہ ناخدا ہیں بحرِ عالم میں
بہت جلدی خبر لیجے مری کشتی ہے طوفاں میں

ایضاً

آوگے جب تم تو بالکل فیصلا ہو جائے گا
کفر سے دیں اک اشارہ میں جدا ہو جائے گا

آیئے گا آپ جب عالم نیا ہو جائے گا
پاؤں کی آواز سے محشر بپا ہو جائے گا

کچھ ہمیں پروا نہیں ہے گر چھپا لے گا فلک
ماہِ نو تیرا گریبانِ قبا ہو جائے گا

ہونگے پھولوں سے زیادہ آپ کے نقشِ قدم
گلشنِ جنت درِ دولت سرا ہو جائے گا

آپ کہلا بھیجیے گا صبر کر آتا ہوں میں
ایک دن ایسا مرا نالہ رسا ہو جائے گا

گر کہوں گا آپ میری التجا سنتے نہیں
اے معاذ اللہ مولا یہ گلا ہو جائے گا

مصلحت ہوگی تو تم کو بھیج دے گا کبریا
آج ہو ہو عود کل وعدہ وفا ہو جائے گا

جب سُنیں گے صور اُٹھ کر قبر سے دوڑیں گے ہم
شورِ محشر تیرے گھوڑے کی صدا ہو جائے گا

کرب میں ہے اور بلا میں لیجیے جلدی خبر
ورنہ آخر نام دل کا کربلا ہو جائے گا

جلد تر پہنچانے کو میرا عریضہ آپ تک
تیز بہتے بہتے سب دریا ہوا ہو جائے گا

سوے شہ جانے کو ہیں سب ضعف سے کہتا ہوں میں
مجھ کو اُٹھنے دے روانہ قافلا ہو جائے گا

آوگے جب تم تو دشمن کڑھیں گے میں ہونگا شاد
وہ بُرا مانیں گے اور میرا بھلا ہو جائے گا

کفر سب عالم میں پھیلے جلد کہتا ہوں رشید
جانتا ہوں اس سے میرا مدعا ہو جائے گا

دوسرے یا تیسرے روز اپنے مکان پر ۸ بجے صبح کو ایک محفل ٹھہرتے قرار دیتے اور رشید وہی نیا قصیدہ دوبارہ پڑھتے تھے۔ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ کثرت سامعین کی وجہ سے مغفور کے وسیع مکان میں گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ اور لوگ دروازہ کے باہر تک کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ رشید نے سوائے خاندان رسالت کے کسی دوسرے کو اپنا ممدوح نہیں بنایا۔ اس لیے صرف مدحِ ائمہ میں قصائد ملے اس کے سوا کچھ نہیں +

یہ قصیدے نہایت سلیس اُردو زبان میں ہیں۔ غزل کے شوخ مضامین سے کوئی شعر خالی نہیں۔ اُن کے قصائد میں بیشتر وہ شان نہیں پائی جاتی جو محققینِ سخن نے قصائد کی تعریف میں ناگزیر لکھی ہے۔ خلاصہ یہ کہ رشید کے قصیدے بھی زبانِ اُردو اور محاورات انیس کے عمدہ نمونے ہیں۔ ذیل میں رشید کے چند قصیدوں کا اختصار درج ہے۔

انتخاب قصائد

در مدح امام دوازدہم علیہ السلام

رہیں ہم بحرِ عالم میں نہیں یہ بات امکاں میں
ٹھہر سکتے نہیں ہیں آکے آنسو چشمِ گریاں میں

کبھی کنگھی جو کرتے آپ کی زلفِ پریشاں میں
پریشانی نہوتی حضرتِ یوسف کو زنداں میں

نہیں جو آپ کا قائل وہ مذہب کچھ نہیں رکھتا
معین ہوگئے ہیں رُکنِ آخر آپ ایماں میں

خدا نے ابتدا اور انتہا کا دھیان رکھا ہے
رسول اللہ کا ہے اور تمہارا نام قرآں میں

نبی فرماتے ہیں جب دیکھتے ہیں واں چمن اپنا
ابھی اک پھول اور آئے گا جنت کے گلستاں میں

تصور میں قریں حضرت کے یوں انصار رہتے ہیں
تعلق جس طرح سے ہے دہن میں دو دنداں میں

اگر نارِ غضب تیری اجازت لیلے رحمت سے
ہمیشہ ابرِ تر سے آگ برسے فصلِ باراں میں

اور اُس کو بلندیِ خیالات۔ یا خوبیِ نظم کی دلچسپیوں سے مایوسی ہو جاتی ہی۔ ان کی غزل میں غزل کا مزہ آتا ہی۔ مگر اُن کے قصائد میں قصائد کا لطف کافی نہیں ملتا+

رہے غالب وہ اُردو کے قصائد ہی میں نہیں۔ بلکہ غزل میں بھی اکثر فارسی کے چست گو مثلاً عرفی و ظہیری کی بلند خیالیوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اُن کے فارسی کلام کا کیا ذکر۔ اس لیے اُن کے مختصر اُردو کے قصائد میں پڑھنے والے کو فارسی کے قصیدہ گویوں کی جھلک نظر آتی ہی۔ بہ حیثیتِ خیال اُردو کا وہی قصیدہ۔ قصیدہ ہی جس کو پڑھ کے کم از کم فارسی کے قصائد کا لطف آ جائے۔ ورنہ نظمِ سخن کے لیے تو بڑی گنجائش ہی+

غزل گو اُردو زبان پر احسان کرتا ہی۔ برخلاف اس کے اُردو کا ایک اچھا قصیدہ گو علوم مشرقیہ کے وقار کو قائم رکھتا ہی۔ اُن کی قوت دکھاتا ہی۔ سلاست تراکیب کی خوبیوں کے علاوہ بلندیِ فکر کے جواہر پیش کرتا ہی۔ غالب نے زبان اُردو پر احسان نہیں کیا بلکہ تخیلِ شعر پر احسان کیا۔ ذوق نے فقط فکرِ قصیدہ سے علوم مشرقیہ کے وقار کو قائم رکھا۔ مگر اپنی غزل گوئی سے زبان اُردو کی پرورش کی۔

صحبتِ قصیدہ خوانی اور رشید

جناب رشید نے عموماً قصائد نہیں کہے۔ اور نہ اُن کو ضرورت تھی۔ اگر کسی رئیس کی تعریف مقصود ہوتی تھی۔ تو اُس کے لیے رباعی کے چار مصرعے کافی تھے۔ وہ مداح امام تھے۔ مداحِ عوام نہ تھے۔ مگر سال میں ایک قصیدہ ضرور کہتے تھے۔ اور عریضہ کے ساتھ پندرہ شعبان المعظم کو (جو ولادت آخر الزمان کی صبح ہی) دریا میں ڈال دیتے تھے۔ اور اُس کے بعد اُسی وقت اپنے مکان ہی پر پڑھا کرتے تھے۔ ایک معقول مجمع ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی بہت سے مشتاق کلام نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کیونکہ وقت بہت نازک ہوتا تھا۔ اس وجہ سے جناب مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ علامۂ ہند مغفور

رشید اور قصیدہ

غزل کے لیے سادگی زبان - خوبی محاورات - نزاکت خیال کی ضرورت ہی۔ مثنوی کے لیے واقعہ نگاری - طرز بیان تعلق و ترتیب درکار ہی + اسی طرح ہر صنف سخن ایک خاص طرز کی محتاج ہی - برخلاف ان سب کے قصیدہ کے لیے - زور الفاظ - چستی بندش - بلندی خیال - سلاست تراکیب - درستی تشبیب - حسن گریز ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر قصیدہ قصیدہ نہیں رہتا بلکہ اور کچھ ہو جاتا ہی - اگر کسی قصیدہ گو میں مذکورۂ بالا سب اوصاف کم و بیش موجود نہوں - یا دو ایک ہوں تو اہل فن کے نزدیک قصیدہ گو کا اطلاق تو اُس پر صحیح ہو جائیگا مگر پھر بھی اُس میں یہ صنف سخن ناقص تصور کی جائے گی +

کامل قصیدہ گو | شعرائے اُردو میں مرزا رفیع سودا نے قصیدہ کو قصیدہ کی حیثیت سے کہا اور اُن کے قصائد بے شبہ اُن سب خوبیوں کے مجموعہ ہیں - جو قصیدہ کے لیے ضروری ہیں - اور اُن کے بعد قصیدہ گوئی میں ذوق و غالب و مومن وغیرہم کی باری آتی ہی + ذوق بے شک ایک فاضل شاعر تھے - اُردو کا پاکیزہ روزمرہ دہلی میں یا تو میر نے کہا یا پھر اُن کے بعد ذوق نے - مگر میں اُن کو سودا کے سامنے کامل قصیدہ گو کہنے کو تیار نہیں حالانکہ اُن کا پورا مجموعۂ قصائد موجود ہی - جس میں جزالت الفاظ و تراکیب چستی بندش بلندی خیال سب کچھ پائے جاتے ہیں - لیکن پھر بھی جن حضرات کی نظر سے فارسی کے چست قصیدہ گو مثلاً خاقانی - انوری - ظہیر فاریابی - عرفی - قاآنی وغیرہم کا کلام گذرا ہو اور بشرطیکہ وہ مذاق سلیم اور نظر وسیع بھی رکھتے ہوں - اُن کے سامنے ذوق علیہ الرحمہ کے جزیل قصیدے - شان الفاظ یا مجموعۂ الفاظ و تراکیب کہے جانے کے سوا اور کچھ وزن نہیں رکھتے - پڑھنے والے کا دماغ جزالت الفاظ کے دباؤ میں دبا جاتا ہی

دی صدا حُر نے کہ محبوبِ الٰہی کے حبیب
ناخدا تجھ سا ملا کھل گئے بندے کے نصیب

بحرِ عصیاں کے تلاطم میں پھنسا ہے یہ غریب
المدد اب مری کشتی ہے کنارہ کے قریب

تو اگر چاہے تو چُک جائے بکھیڑا میرا
پار ہو جائے ترے لطف سے بیڑا میرا

خود پکارے شہِ دلگیر کہ آ بخش دیا
لے خُدا نے بھی ترا جُرم جو تھا بخش دیا

جو گنہ تھا بر سولِ دوسرا بخش دیا
باغِ جنّت تجھے اے ماہ لقا بخش دیا

تذکرہ ہوگا سدا اہلِ وفا میں تیرا
نام موجود ہے فردِ شہدا میں تیرا

سُن کے یہ پاؤں سے لپٹا جو حُرِ نیک سرشت
حُر نے کی عرض اسی واسطے چھوڑا ہے کنشت

پُشت پر ہاتھ دھرا کہہ کے مبارک ہو بہشت
نیچے ان قدموں کے مل جائے زمیں دو بالشت

کفن اس دستِ کرم سے جو عنایت ہو جائے
مجھ سے عاصی کے لیے حُلّۂ جنّت ہو جائے

بے ادب کہنے لگا جلد زباں اپنی تھام
حکم دیدوں کہ تجھے گھیر لے یہ لشکر شام
ابھی اسوار کمندوں میں جکڑ لیں تجھ کو
یہ پیادے مرے لشکر کے پکڑ لیں تجھ کو

سن کے یہ حر کے برادر نے جو بدلے تیور
پھر کے فرزند نے کی تیغ کے قبضہ پہ نظر
میاں سے عبدِ وفادار نے کھینچا خنجر
جا کے خیمہ میں چھپا بھاگ گیا وہ خودسر
حر نے دیکھا کہ قیامت کا ہی غصہ سب کو
ابھی موقع نہیں ہی۔ کہہ کے یہ روکا سب کو

غیظ میں جھوم رہا تھا وہ نجیب الطرفین
ناگہاں دیکھا کہ رانوں میں ہی گھوڑا بے چین
دی صدا حر نے کہ اے دشمنِ اولادِ حسین
لے میں جاتا ہوں ہٹے ابنِ شہِ بدر و حنین
جن سواروں پہ تجھے ناز ہی ٹوکیں مجھ کو
او لعیں کہدے پیادوں سے کہ روکیں مجھ کو

یوں اُڑا وہ کہ دلِ طائرِ سدرہ بھڑکا
اور کڑکا وہ کمانوں کا سنا جب کڑکا
ساتھ چلنے میں ہوا کا بھی کلیجہ دھڑکا
روکنا چاہا تو شعلہ کی طرح سے بھڑکا
غل ہوا فوجِ عدو میں کہ جری جاتا ہی
اُٹھ کے کرسی سے کہا شاہ نے حر آتا ہی

گئے پھر پھر کے تعاقب میں جو آتے تھے سوار
شوقِ پابوسیِ شہ میں ہٹے گھوڑے بڑھا
فوج سے بچ کے نکل آئے یہ چار و ناچار
فرسِ حر نے قریب آ کے بدل دی رفتار
اب جو دیکھا تو حواس آئے ہوئے جاتے ہیں
سامنے حضرتِ شبیر نظر آتے ہیں

جب شبِ قتلِ شہِ دیں کی سحر ہونے لگی

بند ١٤٠ (در حالِ جنابِ حُرؑ)

شبِ عاشور تردد میں بسر کی حُر نے
بیم و اُمید کے عالم میں بسر کی حُر نے

عبد و فرزند و برادر پہ نظر کی حُر نے
من و عن اپنے ارادے کی خبر کی حُر نے

گو نہ کچھ جبر کیا اور نہ اصرار کیا
سب نے آقا پہ فدا ہونے کا اقرار کیا

مرحبا کہہ کے اُٹھا جلد وہ شیدائے امام
دوڑ کر پانی وضو کے لیے لے آیا غلام

حُر نے کی آہ کہ پیاسے ہیں شہنشاہِ انام
دل یہ بھر آیا کہ آنکھوں کے چھلکنے لگے جام

خیر رو رو کے وضو کر لیا ناچاری سے
پڑھ لیں دو رکعتیں خوف و غضبِ باری سے

سوچ کر کہنے لگا خیر میں سمجھا مطلب
دیر سے فکر میں تھا ذہن مرا پہنچا اب

نوکری جاتی رہے گی مجھے اس کا ہے تعب
بولا حُر۔ اب کسی مردود کا نوکر ہوں میں کب

دونوں ملعون ہیں مردود بھی ہیں ظالم بھی
تو بھی اک فاسق و فاجر ہے ترا حاکم بھی

سیّدِ آقا ہمہ دل و جانِ رسولِ عربی
فخرِ والا حسبی مالکِ عالی نسبی

فاطمی و قرشی ہاشمی و مطلبی
بے وضو نام نہ لے کوئی کہ ہے بے ادبی

سارے آئینہ ہیں اسرارِ سماوات اُن پر
خُوب آگاہ ہے تو ختم ہے ہر بات اُن پر

بس خبردار نہ کچھ کہیو اب اے نافرجام
تجھ سے بیہودہ سے بیکار کیے میں نے کلام

خیمۂ حسینؑ میں اطفال خُردسال کے پیے پانی کی ضرورت کا اظہار۔

گذرے ہیں کئی روز کہ پیاسی ہے سکینا
تیروں سے عوض مشک کے چھانو مرا سینا
غم ایسے ہیں دل پر کہ مجھے شاق ہے جینا
اے ظالموں بچوں سے نہیں چاہیے کینا

ہے قوّتِ دل راحتِ جاں سبطِ نبی کی
پیاری وہی بیٹی ہے حسینؑ ابن علی کی

چشم مبارک میں تیر لگنا مشک میں سوراخ ہونا اور عباسؑ کا بچوں کی تقدیر پر تاسف کرنا

کیا کھینچ سکیں ہاتھ نہیں رنج ہے طاری
مشکیزہ میں سوراخ ادھر کر گیا ناری
تھا فکر میں اُس تیر کی وہ عاشقِ باری
پانی جو بہا آنکھوں سے آنسو ہوے جاری

اُس مشک کو اشکوں سے بھگویا کیے عباس
اُن پیاسوں کی تقدیر پہ رویا کیے عباس

حضرت عباسؑ کا وقتِ آخر امامؑ کو آواز دینا۔

دی شاہ کو آواز کہ جلد آییے بھائی
تکلیف مرے واسطے فرمایئے بھائی
مشتاق ہوں صورت مجھے دکھلایئے بھائی
اعدا ہیں بہت پاس ہٹا جایئے بھائی

خادم کا بھی قاسم کی طرح حال نہو جائے
آقا یہ غلام آپ کا پامال نہو جائے

امام حسینؑ ہیں حالتِ بیتابی تشریف لاتے ہیں۔

اے اہلِ ستم میرا مددگار کدھر ہے
جس پر یہ چلی ظلم کی تلوار کدھر ہے
کیوں بھائیو وہ عاشقِ سرشار کدھر ہے
یارو مرے لشکر کا علمدار کدھر ہے

بتلاو کہاں صاحبِ شمشیر کو مارا
کس دشت مصیبت میں مرے شیر کو مارا

اب میاں سے تیغوں کو نکلنے نہیں دیتے — عاجز ہے کماں تیر کو چلنے نہیں دیتے
پہلو بھی پیادوں کو بدلنے نہیں دیتے — گھوڑوں پہ سواروں کو سنبھلنے نہیں دیتے
لاکھوں کو دمِ تیغ زنی ٹوک رہے ہیں
بڑھتا ہے جو غصّہ تو اُسے روک رہے ہیں

حضرت عباس کا نہر پہ قبضہ

عباس کی صورت ہے کہ ہے قدرتِ باری — دریا کو یہ حیرت ہے کہ پانی نہیں جاری
دامن کی ہوا بن گئی ہے بادِ بہاری — اب اور قریب آ گئی ہے بڑھ کے سواری
نزدیک جو ہے نہر کلی دل کی کھلی ہے
ہے فوج کی کشتی کہ کنارہ سے ملی ہے

جوشِ شجاعت میں نعرۂ شیرانہ

ہم گھاٹ تک آئے نہ کوئی سامنے آیا — شمر و عمرِ سعد نے بھی مُنہ نہ دکھایا
ہم نے تو لڑائی کا مزا خاک نہ پایا — دریا پہ بھی ڈھالوں کا سیہ ابر نہ چھایا
کیا نہر تک اب بھی مرے آ جانے میں شک ہے
تیغوں کی چمک ہے نہ کمانوں کی کڑک ہے

دم لے کے بڑھے حضرتِ عباسِ دلاور — رہوار کو ٹھکرا کے گئے نہر کے اندر
دریا سے بہت دور نظر آتا تھا لشکر — دی بڑھ کے صدا مشک جو بھرنے لگے جھک کر
تم یہ نہ سمجھنا کہ پیے جاتے ہیں پانی
لو روکنے آؤ کہ لیے جاتے ہیں پانی

واپسی طرف خیمہ و حفاظت مشک

ہر سو سے چلے آتے ہیں سب اہلِ ستم پاس — لڑتے ہوئے میداں سے چلے آتے ہیں عباس
ہے خوف نہ کچھ جان کے جانے کا ہے وسواس — پانی کے پہونچنے سے مگر ہو گئی ہے یاس
نیزوں سے جو رہ اہلِ سقر روکے ہوئے ہیں * یہ مشک سکینہ پہ سپر روکے ہوئے ہیں

ہے تیز روانی میں کہیں سیل فنا سے
ہر مرتبہ آگے ہے وہ چلنے کی صدا سے
جھک جھک کے گلے ملتی ہے ارباب جفا سے
جب بڑھ کے ذرا چلتی ہے کہتی ہے قضا سے
رکتی نہیں روکیں کہ ستمگار نہ روکیں
اللہ کرے ہاتھ علمدار نہ روکیں

ہر وار میں گر گر کے لعینوں کا پھڑکنا
سب ناریوں پہ تیغ کے شعلہ کا لپکنا
وہ زیر علم چہرۂ تاباں کا چمکنا
اُڑنا وہ پھریرے کا وہ پنجہ کا چمکنا
تھا شور یہ ساعت بھی سدا یاد رہے گی
یہ شان یہ شوکت یہ وغا یاد رہے گی

دو چار صفیں جب تہ تیغ دو سر آئیں
مسدود جو تھیں جنگ کی راہیں نظر آئیں
اب ہاتھ جو حاضر ہیں اب زد پہ آئیں
یوں انگلیاں لپٹی ہیں کہ قبضہ میں در آئیں
وا عقدۂ جاں کر دیا ہر ایک شقی کا
پھل تیغ کا ترشا ہوا ناخن ہے علی کا

بھر بھر کے لہو میں ہوئی تیغ دو سر آتش
کرتی نہیں دریا کو مضرت مگر آتش
ہے ناریوں کا خون کہ شعلہ ہے وہ آتش
ہے بیچ میں پانی ادھر آتش اُدھر آتش
غصہ کی حرارت ہے جو یہ حال ہوا ہے
ہے گرمیٔ رفتار کہ منہ لال ہوا ہے

جس دم وہ گری لاشوں سے رن پاٹ کے اُٹھی
فوجوں پہ جھکی یاں تو قریں گھاٹ کے اُٹھی
منہ اور کھلا جب وہ لہو چاٹ کے اُٹھی
سر کیا ہیں زمیں کا بھی طبق کاٹ کے اُٹھی
غصہ ہے یہ سرخی ہے کہاں خون عدو کی * جوہر نظر آتا ہے ہر ایک بوند لہو کی

شوکت وہ علمدار کی وہ شانِ علم کی — تلوار کی بجلی کبھی ٹھیری کبھی چمکی
آواز بھی آتی نہیں گھوڑے کے قدم کی — پامال ہوئی جاتی ہی سب فوج ستم کی
ہی سرخ زمیں خون جو اعدا کا بہا ہے
وہ شیر کے نعرے ہیں کہ رن گونج رہا ہی

جس نے انھیں ٹوکا اُسے زندہ نہیں چھوڑا — فوجیں ہیں بہت گرد مگر دل نہیں تھوڑا
اُس ہاتھ میں ہی باگ نہ اس ہاتھ میں کوڑا — جس سمت نظر پھرتی ہی پھر پڑتا ہی گھوڑا
کیوں کر نہ اشارے میں ہو وہ خوش سیر ان کے
گویا کہ لگام اُس کی ہی تارِ نظر ان کے

توصیف فرس خوش عنان

اُڑتا ہی فرس بن گئے ہیں دامنِ زیں پر — رکتا ہی کسی سے نہ ٹھہرتا ہی کہیں پر
ہی نعل کا پرتو مہِ نو چرخِ بریں پر — کھلتے ہیں گلِ نقشِ قدم رن کی زمیں پر
ہی بلبلِ شیدا بھی مقرّ جلوہ گری کی
کیا چال اُڑائی ہی نسیمِ سحری کی

اس رخش کو عباس سا اسوار سنبھالے — دوڑے جو صبا ساتھ پڑیں پاؤں میں چھالے
نرغہ میں جہاں پہلوؤں سے مل گئے بھالے — رہوار نے گویا پر پرواز نکالے
سب شامیوں سے بھر کے طرارا نکل آیا
شب ختم ہوئی صبح کا تارا نکل آیا

صفت شمشیر

شمشیر تیغ کا ہی رشتۂ جاں کے لیے مقطع — مہرِ فلکِ فتح و ظفر کا ہی یہ مطلع
ہی حق کی عنایت سے کل اوصاف کا مجمع — جوہر کے جواہر سے ہوئی ہی یہ مرصع
ہوتے ہیں رواں قافلے اربابِ جفا کے * ناہیں نہیں جادے ہیں یہ صحرائے فنا کے

چلائیں نہ اتنا پے کی بلا آتی ہے سر پر / اس وقت تو قابو ہے نہ دل پر نہ جگر پر
کس قہر کی آتی ہے تباہی مرے گھر پر / روتی ہوں۔ کہ بس ہے فقط اک دیدۂ تر پر
لونڈی ہوں کسی طرح کی عزت نہیں رکھتی
روکوں تمہیں اتنی بھی لیاقت نہیں رکھتی

آقا سے کہوں آپ انہیں روکیے یا شاہ / فرمایا۔ کہ ایسا نہ کہیں کیجیو للہ
بس اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گی واللہ / باعث یہی عزت کا ہے کیا تم نہیں آگاہ
دامن کہیں تم بہر خدا تھام نہ لینا
جاتا ہوں میں اب روکنے کا نام نہ لینا

جناب عباسؑ کا صحن میں تشریف لانا اور جناب سکینہ کی گفتگو

جب صحن میں آیا وہ یداللہ کا جانی / شاہ شہدا کرنے لگے اشک فشانی
کی بیبیوں نے باندھ کے صف مرثیہ خوانی / دی مشک سکینہ نے کہ لا دو ہمیں پانی
تھا باتوں پہ نادان کی غل آہ و بکا کا
ضد کر رہی تھیں ہاتھ میں دامن تھا چچا کا

یہ کہتے تھے دم بھر کی مصیبت ہے یہ جھیلو / وہ کہتی تھی بھر جائیو پانی مجھے دے لو
یہ کہتے تھے قربان چچا بچوں میں کھیلو / وہ کہتی تھی مانوں گی نہیں گود میں لے لو
گودی میں نہیں تھامے ہوئے ہاتھ چلوں گی
پیاسی ہوں بہت نہر پہ میں ساتھ چلوں گی

عزم میدان شان جناب عباسؑ

چومے قدم شاہ چڑھا گھوڑے پہ غازی / باگ اٹھتے ہی طاؤس جناں بن گیا تازی
سرعت نے دکھائی یہ نئی شعبدہ بازی / خود ہو گئی کوتہ رہ میداں کی درازی
اعدا سے نگہ صاحب شمشیر نے بدلی * جب سامنے صید آئے نگہ شیر نے بدلی

کی عرض یہ سردار ہیں یا سیدِ ابرار
لازم ہے کہ سردار کے آگے ہو علمدار
پہلے مرے مرنے کا ہو غُل فوجِ لعیں میں
مختار ہیں پھر جائیں یہ فردوسِ بریں میں

ان کو طرفِ فوجِ ستم جانے نہ دونگا
پہلے کبھی یا شاہِ امم جانے نہ دونگا
خود جاؤں گا پر سوئے عدم جانے نہ دونگا
میں آپ کے قدموں کی قسم جانے نہ دونگا
مالک پہ نہ صدقہ ہو ملازم سے نہ ہوگا
یہ خوش ہوں کہ ناراض یہ خادم سے نہو گا

محبتِ برادر

ان باتوں پہ آیا جو شہِ دیں کو بہت پیار
لپٹا کے گلے رونے لگے سیدِ ابرار
قدموں کی طرف جھک گئے عباسِ علمدار
شہ نے کہا ہاں ہاں مرے مونس مرے غمخوار
طاقت ہے نہ اب صبر کا مقدور ہے مجھ کو
پر جس میں ہو تم خوش وہی منظور ہے مجھ کو

بعد طلبِ رخصت حضرت عباس کا خیمہ میں جانا اور زوجہ سے گفتگو۔ ایسے مواقع پر زن و شوہر کے جذبات کا کما حقہٗ اظہار

کپڑے جو بدلنے لگا وہ شاہ کا شیدا
زوجہ نے کہا رو کے کہاں کا ہے ارادہ
بولے کہ ہے جنت کی طرف قصدِ سفر کا
ممکن نہیں میدان سے پھر کر مرا آنا
فوجیں نہ بڑھ آئیں کہیں اندھیر نہ ہو جائے
کہنا ہو جو کچھ جلد کہو دیر نہ ہو جائے

بولیں کہ خدا کے لیے مرنے کو نہ جاؤ
صاحب ہمیں پردیس میں بیوہ نہ بناؤ
روتے ہیں پسر دونو کو نزدیک بلاؤ
شفقت سے انھیں پیار کرو پاس بٹھاؤ
گھر سے نہ نکل جائیں کہیں بعد تمہارے
مجھ سے یہ سنبھلنے کے نہیں بعد تمہارے

عباسؑ نے جب رن کی رضا شاہ سے چاہی

بند ۱۰۴ (درحال جنابِ عباسؑ)

طلب اجازت جناب عباسؑ پر امام حسینؑ افسوس فرماتے ہیں اور کہتے ہیں۔

افسوس ہے اتنے برس تک جنھیں پالا — وہ مرنے کو جاتے ہیں یہ انداز نکالا
دو روز بھی گھر بعد ہمارے نہ سنبھالا — کس طرح کی فصل آئی ہے اللہ تعالیٰ
جو قوتِ بازو تھے وہی چھوڑ چلے ہیں
تھا جن سے قوی دل وہی دل توڑ چلے ہیں

ہم نے کسی عالم میں کسی کو نہیں چھوڑا — راحت ہوئی یا رنج کبھی منہ کو نہ موڑا
جس امر کی ضد کی وہ کیا دل نہیں توڑا — پر اب غم و اندوہ سے دل ہو گیا تھوڑا
ہم کچھ بھی بحالِ خفگی کہہ نہیں سکتے
لیکن یہ جدائی کا قلق سہہ نہیں سکتے

برادر جاں نثار کا طلب نصرت اور متانت آمیز لہجہ

اے بحرِ کرم میر امم اے شہِ جمہور — خادم قدمِ پاک سے ہوتا نہ کبھی دور
ہیں امر وہ درپیش کہ اس وقت ہوں مجبور — خوشنودیِ حق دین کی تائید ہے منظور
اس بات سے خوش ہوتے ہیں ہاں آپ بھی آقا
فرمائیں نہ اس باب میں عذر آپ بھی آقا

امام حسینؑ کا حضرت علی اکبرؑ کو پہلے اجازت جنگ دینے کا ارادہ اور جناب عباسؑ امداد اپنے لیے

ارشاد کیا شاہ نے اے حق کے فدائی — میں بھی تو کسی وجہ سے مجبور ہوں بھائی
ہو کون مددگار جو ہو تم سے جدائی — مجھ کو بھی تو منظور ہے اب عقدہ کشائی
رانڈیں ہیں نہ لٹیں روکنے والا کوئی ہو
پردے میں بٹھائے انھیں ایسا تو کوئی ہو

حامل علمِ فوج کے ہو تم مرے غمخوار — اکبر سے کہو جائیں سوئے لشکرِ کفار

ساقیا بادۂ اُلفت سے ہوئے ہیں سرشار
مَے کشی گر یہ گنہ ہو تو کریں استغفار

کسی عالم میں بہکتے نہیں تیرے میخوار
کہے دیتے ہوں کہ سمجھائے نہ کوئی زنہار

جوش میں جام سے شیشے ابھی لڑ جائیں گے
نام توبہ کا سُنیں گے تو بگڑ جائیں گے

اصل کیا خُم کی بھلا ساغر و مینا کیا ہے
چیز کیا پیرِ مغاں ساقیِ دُنیا کیا ہے

کیا سمجھتا ہوں مئے ناب کا دریا کیا ہے
کیوں کسی اور سے مانگوں مجھے پروا کیا ہے

دل میں آئے گا تو بھر دے گا کبھی جی میرا
میں جیوں اور سلامت رہے ساقی میرا

کس کا منہ ہی جو بڑھے یا سوئے شمشیر چلے — جس کو چلنا ہو سوئے نار وہ بے پیر چلے
یوں تو تلواریں چلیں۔ نیزے چلے۔ تیر چلے — تھیں صفیں صاف جدھر حضرت شبیر چلے
ایک کو بھی ہنرِ جنگ دکھانے نہ دیا
ہاتھ اُٹھنا تو کہاں سر بھی اُٹھانے نہ دیا

کشتیِ تیغ چلے فوج کا دریا گھٹ جائے — کیا عجب آج اگر قعرِ جہنم پٹ جائے
کہد و میدان سے ہر ایک فرشتہ ہٹ جائے — مثلِ جبریل کوئی پر نہ کسی کا کٹ جائے
اور نزدیک اگر فوجِ شرر آجائے گی
سب کو خیبر کی لڑائی نظر آجائے گی

تیغ جب بڑھتی ہی سب فوج سرک جاتی ہی — یہ وہ شعلہ ہی کہ تا چرخ لپک جاتی ہی
وہ ادا ہی کہ ہر اک روح پھڑک جاتی ہی — رن سے اس برق کی کوندے میں چمک جاتی ہی
ہوش گم کر دیے ہیں یوں دمِ پیکار چلی
لوگ کہتے ہوئے جاتے ہیں کہ تلوار چلی

ساقی نامہ پڑھنے والے کو مست کر دینے والے خیالات

اُسی ساقی سے رہی چشمِ کرم عالم کو — اپنا میکش کیا موسےٰ کو ابنِ مریم کو
بادۂ عشق سے سرشار کیا آدم کو — بخشوانے کے لیے دی مئے اُلفت ہم کو
نشہ اُس روز کا ہم سب کو ابھی باقی ہی
محفلِ دلِ اسلام کا وہ ساقی ہی

کس طرح ہوتی ہی یا عمر بسر دیکھ تو لے — ہو چکا حال بہ نزعِ دگر دیکھ تو لے
تشنۂ دید کو اب ایک نظر دیکھ تو لے — بھر چکا جام مرا پھیر کے ادھر دیکھ تو لے
وقت آخر ہی خوش انجام سے ناکام ملے — جان ہونٹوں پہ ادھر آئے ادھر جام ملے

کبھی دل تھام کے چلاتے تھے اکبر اکبر
مضطرب ہوتے تھے جب جاتی تھی لاشوں پہ نظر
غم جو عباس کا تھا تھامے تھے ہاتھوں سے کمر
داغ کو اس ہاتھ سے اُس ہاتھ سے تھامے تھے جگر
جوشِ غم تھا کبھی اُٹھتے تھے کبھی گرتے تھے
دل نہ تھمتا تھا تو بیتاب پڑے پھرتے تھے

کبھی لاشوں کی طرف دیکھ کے کرتے تھے کلام
اے حبیبو گلا کٹنے کا آیا ہنگام
اے زہیر اب غم و اندوہ سے ہے کام تمام
کب سے سب میری خبر لو میں تنہا رہا ہوں امام
مطمئن ہو دلِ خستہ جگر آواز تو دو
نہ اُٹھو میری مدد کو مگر آواز تو دو

امام حسینؑ اور [illegible] صفت اسپ [illegible]

چال اس طرح کی ہے پریوں کے دل ملتی ہے
کستا ہے سینہ سے ہیکل جو ذرا دہلتی ہے
یہ بلاوہ ہے کہ نالے سے نہیں ٹلتی ہے
تیز کچھ بھی نہیں کہنے کو ہوا چلتی ہے
ناز و اعجاز دکھانے پہ اگر آئے ابھی
چشم سوزن سے نگہ بن کے نکل جائے ابھی

آ کے میدان میں ٹھہرے جو شہنشاہِ زمن
چوٹ ڈنکے پہ لگی گونج گیا سارا رَن
آئی آوازِ تکبیر اور ہوا شور بزن
دشت سے جو کڑیاں بھر کے ہوئے شیر ہرن
واں جو ہر ظالم و گمراہ کے تیور بدلے
یاں بھی شیر اسد اللہ کے تیور بدلے

تیغ حسینی کی تعریف

ہے خداداد یہ تیغ اس کا بھلا کہنا کیا
آب کی طرح سے مشہور ہے اس کا بڑھنا
پھل ہے قبضہ میں کہ نکلا ہے یہیں سے دریا
جو قریب اس کے ہوا اُس سے بھی یہ تھا نہ جدا
تیز چلنے کی صفائی کی کبھی خو نہ گئی * اس طرح نکلی کہ کاٹھی بھی کبھی چھو نہ گئی

اس قدر کثرتِ گل ہے کہ نہیں جس کا حساب
میں یہی جانتی ہوں یہ چمن کیسا ہے عذاب
پتی مہندی کی ہر اک کا بجا یہ کرتی ہے خطاب
دمبدم فصلِ بہاری اُسے دیتی ہے جواب
شوق پسنے کا ہے ہر دم اسی تدبیر میں ہے
روزِ اول ہی سے پسنا تری تقدیر میں ہے

آتشِ گل سے نہیں بلبلوں کو کچھ بھی ضرر
عشق میں باعثِ دلگیری ہی کا ہے اثر
ہے شرارہ سے بھی کہیں گرم آتشِ تر
گل ہر اک شعلہ سے بڑھ کر ہے جلتے نہیں ہم
عشق کس طرح نہو کیوں نہ کریں خواہشِ گل
کہ عنادل کے عناصر میں بھی ہے آتشِ گل

قطرے شبنم کے ہر اک سمت ہزاروں ہیں عیاں
جوہری آتے ہیں دھوکے میں میانِ گلستاں
ہیں شجر سارے مرصع یہی ہوتا ہے گماں
ابرِ نیساں کا بھلا کون اٹھاتا احساں
کیسے ہیں فصلِ بہاری نے یہ جوہر پیدا
کہ درختوں میں بھی ہونے لگے گوہر پیدا

چال ہے بادِ صبا کی کہ ہیں بیتاب شجر
کبھی اس گل پہ عنایت ہے کبھی اس گل پر
دمبدم لیتی ہے گلزار میں اک اک کی خبر
کبھی جاتی ہے اُدھر اور کبھی آتی ہے اِدھر
شوق میں لوٹتے ہیں برگِ خزاں دیدہ بھی
کروٹیں لے رہا ہے سبزۂ خوابیدہ بھی

جنابِ امام حسینؑ عالمِ تنہائی میں ہر عزیز و ناصر کو نام بنام آواز دیتے ہیں اور مدد کو بلاتے ہیں

جب عزیزوں سے شہنشاہِ اُمم چھوٹ گئے
ایک مدت سے جو رہتے تھے بہم چھوٹ گئے
سب غلاموں سے بھی آقا کے قدم چھوٹ گئے
رو کے فرماتے تھے احباب سے ہم چھوٹ گئے
لاشے جو سامنے تھے جانِ حزیں گھٹتے تھے * آہیں کرتے تھے کبھی اور کبھی روتے تھے

پانی کے زور سے فواروں نے قوت پائی | دست و پا بیلوں نے پھیلا دیے راحت پائی

ہے سکوں سب کو ہر اک امر میں آسانی ہے
آئینہ چوکھٹے میں نہر میں یا پانی ہے

ہے جوانانِ چمن کی ہر ادا خوش اسلوب | کیسے خوش رنگ لباس اُن کے وہ شکلیں مرغوب
بلبلیں باغ میں طالب ہیں تو گل ہیں مطلوب | سایۂ شمشاد کا ہے روکشِ قدِ محبوب

بدلی آ آ کے جو ہر بار برس جاتی ہے
کہیں دھوپ اور کہیں چھاؤں نظر آتی ہے

جا بجا پھولوں کے انبار ہیں جس طرح پہاڑ | اب تو کیسی ہی خزاں آئے نہ گلشن ہو اُجاڑ
ہے بلا آج نہیں ہے گل و بلبل میں بگاڑ | بیٹھی ہے جا کے قریں دیکھ کے پتوں کی آڑ

گل و بلبل کے راز و نیاز کا وقت اور صیاد کے دخل دینے پر بلبل کا زبان حال سے [illegible]

پائے صیاد کی آہٹ جو ذرا پاتی ہے
سیکڑوں باتیں سناتی ہوئی اُڑ جاتی ہے

باغ میں فصلِ بہار آئی کہ ایامِ شباب | باغباں سے ہوئی خوش لے کے زرِ گل کا حساب
حسن کے واسطے سنبل کو دیا پیچ و تاب | اس طرح سبزہ کو روندا کہ ہوا وہ شاداب

ناز دیکھو کہ جدھر بادِ بہار آ کے چلی
تو ہر اک غنچہ کو ہر پھول کو ٹھکرا کے چلی

صبح اور اُس کے مناظر کی دلفریبی نظارہ کن نگاہوں کی محویت

وہ سماں صبح کا کہنا میں طاؤس کا شور | تارے چھپنے میں نظر آنے لگے دیدۂ مور
ایسا دکھلا رہی ہے فصلِ بہار اپنا زور | دیکھتے دیکھتے نرگس کی ہوئیں آنکھیں کور

کیفیت ایسی اُدھر تھی کہ اِدھر پھیر نہ سکی
پہونچی تو چہرۂ ہر گل پہ نظر پھیر نہ سکی

محضرِ خونِ شہیداں ہے مرادامنِ دل

بند ۹۶ (در حالِ امامؑ)

صبحِ عاشور کا معکوس اثر

صبحِ عاشور کی جب دشت میں تنویر ہوئی
رَن میں جو شئے تھی وہ اک نور کی تصویر ہوئی
لیلیِ شب کی جوانی نہ رہی پیر ہوئی
دل جلے سرد ہوا میں نئی تاثیر ہوئی
یوں ہلے برگِ شجر شورِ فغاں اُٹھنے لگا
شبنم اُڑنے لگی آہوں کا دھواں اُٹھنے لگا

نمازِ سحر ادا، مرتبہ انصار، عبادت گذار

ہوئے مشغول نمازِ سحری میں سرور
سب کے سب ثانیِ مقداد و تمیم و بوذر
پیچھے صف باندھے ہوئے سارے عزیز و یاور
رتبہ میں فرش سے کعبہ کے مصلے بہتر
متوجہ سوئے حق قلب و جگر تھے اُن کے
پاؤں تھے فرش پہ اور عرش پہ سر تھے اُن کے

طلوعِ خورشید

تاجِ زریں سے ہوا جب سرِ گردوں پر نور
رنگ وہ چرخ کا وہ مہر کا مشرق سے ظہور
خضر نے چاہا کہ ہو قلزمِ اخضر سے عبور
شیر کا چہرہ نظر آتا تھا سبزہ میں دور
کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سُرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے

جنت نشانِ عالم، قدرتی مناظر

پھول کھلنے لگے بلبل کی صدا آنے لگی
غنچے گل ہونے لگے بادِ صبا آنے لگی
کہ نظر باغ کی صحرا میں فضا آنے لگی
ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ دریا سے ہوا آنے لگی
بچے ہر مرتبہ آقا کی طرف مڑنے لگے
زُلفیں ہلنے لگیں دامانِ قبا اُڑنے لگے

پھولوں نے فصلِ بہار آتے ہی رنگت پائی
زرِ گل لُٹ گیا گلچیں نے یہ دولت پائی

حالِ زینب کا جو کچھ تھا نہ دکھائے داور
ساتھ کھنچتی ہوئی جاتی تھی زمیں پر چادر
دَوڑ کے جاتی تھیں اس سمت کبھی گاہ اُدھر
خاک پر بیٹھ کے آخر یہ پکاریں مضطر

موردِ رنج و غم و دَرد و پریشانی ہوں
امّتی لوگو خبر لو کہ میں سیدانی ہوں

تلوار کی تعریف

فوجیں ہٹنے لگیں بڑھنے لگے سلطانِ زماں
قبضہ تک ہاتھ کا آنا تو ہوا سب پہ عیاں
برچھیاں اُٹھیں کڑکنے لگی ہر ایک کماں
یوں چلی تیغ کھلے جیسے سخنور کی زباں
جلد تر اپنے کو اپنوں سے چھڑا کے نکلی
میان سے نکلی چمک بعد یہ پہلے نکلی

موت کہتی ہے ترے سامنے میں ہوں کہ کہن
ایسی میں نے نہیں لیں اور نہیں جانیں ان گن
گو کہ ہے فرق مرے جاں مرے تیرے سن میں
سچ بتا مجھ کو بتا دے گی یہ فن گردن میں
جب کہ دنیا ہوئی ہے خلق یہیں جب آئی ہوں
کچھ نہ آیا تو سمجھتی ہوں کہ اب آئی ہوں

کھل گیا صاف کہ ہے پیرِ اجل اور یہ جوان
سچ یہ ہے قابلِ تحریر ہے جو اس کی شان
اس کا کھنچنا ہے کہ ہے جنگ و جدل کا اعلان
جوہر اس میں ہیں کہ لکھا ہوا ہر یک قرآن
شاہ دکھاتے ہیں قسم بخششِ اُمّت کے لیے
کہ اُٹھایا ہے اسے آج شہادت کے لیے

شہادت امام حسین اور جناب زینب کی فریاد۔ اہل قریہ سے درد آمیز خطاب۔

رن میں جس وقت سنی قتلِ شہِ دیں کی پکار
شاہ ابرار کی گردن پہ جو دیکھی تلوار
ننگے سر خیمہ سے زینب نکل آئیں اک بار
پسرِ سعد سے کہنے لگیں او نا ہنجار
تہِ خنجر دلِ محبوبِ خدا ہے ظالم
وائے ہو تجھ پہ کہ تو دیکھ رہا ہے ظالم

کبھی قریوں کی طرف دیکھ کے دیتی تھیں صدا
تم میں مہمان ہے دلبندِ رسولِ دوسرا
ہو عرب اور حمیت نہیں اے اہلِ قرا
کس سے فریاد کریں کوئی بھی باقی نہ رہا
اب طلبگار ہوں امداد کی کس سے جا کر
دیکھو ہم لٹ گئے بستی میں تمہاری آ کر

ہاں مگر اجرِ رسالت کا یہی ہے بادا
اوّل اُن اہلِ قرابت میں تجھی کو پایا
کہ عنایت سے مودت جسے خالق نے کہا
جو طلبگار ہو کرتا ہے خود اللہ عطا
مذہبِ بندہ نصیری سے جدا ہے ساقی
تو نہ دے خیر ہمارا بھی خدا ہے ساقی

لشکر اعدا کی تیاری پر تمام انصار حسینی کا آمادۂ جنگ ہونا خصوصاً جناب عباس کا برہم ہونا۔ اور امام کا ان کو ٹھیر سمجھانا

دھوپ نکلی کہ ہوئے حشر کے آثار عیاں
خبر آئی کہ ہے تیار اُدھر فوجِ گراں
بیٹھے تھے خیمۂ انصار میں سلطانِ زماں
قتلِ سادات کا سب سج گیا رن میں ساماں
باجے بجتے ہیں زمیں دشت کی تھراتی ہے
بڑھ کے ڈنکے کی صدا کوہ سے ٹکراتی ہے

یہ خبر سنتے ہی سب خادمِ سرکار اُٹھے
بگڑے عباس علی ٹیک کے تلوار اُٹھے
جانیں آقا پہ فدا کرنے کو انصار اُٹھے
دیکھ کے شیر کا غصہ شہِ ابرار اُٹھے
آپ اُس وقت بھی اعدا پہ ترس کھانے لگے
ہاتھ شانے پہ دھر بھائی کو سمجھانے لگے

توصیف فرسِ امام۔

اُس کو خالق نے دیا مرتبہ کیا اس میں کلام
گر یہ تشبیہ نہو عفو کرے ربِّ انام
ہے پیمبر کا فرس اور سوار اس پہ امام
دو یہ قرآن کی سطریں ہیں کہ ہے اس کی لگام
حوریں ہر مرتبہ لیتی ہیں بلائیں اس کی
حلقۂ چشمِ ملک دو نو رکابیں اس کی

جان اُس گھوڑے میں اور تیغِ علی میں دم ہے
ڈر جو ہے آیا تو پامال کرے گا یہ فرس
قدم اُس کے کبھی چوموں یہ ہوا کو ہے ہوس
ہر طرارے یہ صدا دیتے ہیں اعدا بس بس
رحم آتا ہے جو سب خوف سے چلّاتے ہیں * تو آپ باگوں کو بہت کستے ہوئے آتے ہیں

خود بخود جوش میں بل کھا گئی زلفِ سنبل — مست کرنے لگا کہسار میں طاؤس کا غل

پتیاں قطرۂ شبنم سے نمو پائے ہوئے
کس کی اُلفت میں ہیں ہیرے کی کنی کھائے ہوئے

پوری اُمیدیں ہوں وہ وقت وہ بار آجائے — پوری پوری نظر آنکھوں کو بہار آجائے
دل عاشق کو تمنا ہے کہ یار آجائے — پیشِ خیمہ ابھی آیا ہے بہار آجائے

غنچے سب چٹکیں تو باتیں ابھی ساری بن جائیں
جرسِ قافلۂ فصلِ بہاری بن جائیں

کثرتِ گل

ایسی ہے کثرتِ گل جس کا ٹھکانا ہی نہیں — زلزلہ آئے تو اب ہل نہیں سکنے کی زمیں
ڈھیر دم بھر میں پہنچنے کو ہیں تا چرخِ بریں — ہر طرف لوٹ رہی یوں چمن ہے ہیں پھول حسیں

چور مہندی میں ہے بلبل ہی چلاتی رہی
آخر اس بھیڑ میں نرگس کی نظر جاتی رہی

ساقی نامہ

ساقیا جلد خبر لے ترا مے خوار ہوں میں — ہوشیار ہے بڑا عاشقِ سرشار ہوں میں
غیر سے مانگ کے عاصی ترا پیکا ہوں میں — جام دیدے مجھے جب تجھ سے طلبگار ہوں میں

کر کے بے ہوش مجھے ہوش میں لانے والا
کون ہے تیرے سوا میرا پلانے والا

خیر پوری نہ کرے میری تمنا نہ سہی — مے اُلفت مجھے جی بھر کے نہ دیگا نہ سہی
نہر بادہ نہ سہی قلزم و دریا نہ سہی — نہ سہی جام و سبو و خم و مینا نہ سہی

ساقیا بوذر و مقداد کا رتبہ تو ہو
جس قدر تشنہ تھا سلمان کو اُتنا تو ہو

شاہ پر ماریہ میں ابرِ الم چھانے لگے
بند ۱۰۰ (درحال جناب امام حسینؑ)

شاہ پر ماریہ میں ابرِ الم چھانے لگے
شب عاشور چلی غم کی خبر پانے لگے
چرخ پر صبح کے آثار نظر آنے لگے
ہر طرف مرغ سحر دشت میں چلانے لگے
دل جو بھر آیا تو اک آہ بھری حضرت نے
کی ادا اُٹھ کے نماز سحری حضرت نے

آمد صبح

شان وہ صبح کے آنے کی وہ لطفِ صحرا
چتر زر خسرو خاور کا افق سے چمکا
گندمی رنگ کے معشوق کا چہرہ نکلا
کسی محبوب کی ہے زرد قبا کا پردا
زعفراں کا ہے یہ کھیت اس کا ہے غل خلقت میں
گل صد برگ کھلا ہے چمن جنت میں

طلوع مہر

سُرخی مہر سے روشن ہے کہ ہے شعلۂ طور
نئی صورت سے ہے اب نوح کے طوفاں کا ظہور
سیل کی طرح لگا پھیلنے ہر سمت کو نور
ہر طرف شور ہوا خلق میں فار التنور
ہے یہ طوفان نیا اس میں نئی خوبی ہے
سب نظر آتے ہیں یوں خلق خدا ڈوبی ہے

حضرت کا خیمہ سے برآمد ہونا۔

بزم انصار میں جب وہ شہ ذیشاں آیا
دست بوسی کو ہر اک صاحب ایماں آیا
ساتھ احمد کے ہر اک خاصۂ یزداں آیا
حوریں حاضر ہوئیں پابوسی کو رضواں آیا
جوش پر رحمت رب دوسرا بھی آئی
سب کے سب آئے تو جنت کی ہوا بھی آئی

بہار

پھر بہار آنے میں کیا دیر تھی کھلنے لگے گل
وجد میں لائی درختوں کو صدائے بلبل

سب فوج منتشر ہی عجب انتشار ہی
ہر تیغ یا ستارۂ دنبالہ دار ہی
جوہر ہر ایک دیدۂ مردم شکار ہی
قبضہ بھی اس کا تاج سرِ اعتبار ہی
سب کے سروں پہ چلتی ہی پایہ بلند ہی
ہی ہاتھ میں حسینؑ کے رتبہ بلند ہی

حلۂ امام سے لشکر کا حال تباہ - اور سب کی ہان جلبی - ایک پہلوان کی آمد - اور موت

ٹھیرے امامِ دیں جو سُنا شورِ الاماں
کاندھے پہ رکھی بوجھ کے تیغ شرر فشاں
اک سمت کانپ کا ٹیکا اونچا ہوا نشاں
لشکر سے ڈرتے ڈرتے بڑھا ایک پہلواں
لنگر دیا رکابوں پہ جس دم لعین نے
مشکل سے اُس کا بوجھ سنبھالا زمین نے

ساقی نامہ

ساقی کہہ دے کوئی کہ اب دیر کیا ہی آئے
ہی ہی یہ مُی نہیں اسے خُمِ غدیر لائے
حسرت میں جان جاتی ہی جلدی مجھے پلائے
ہوں دردمند دل کے تڑپنے سے تنگ آئے ہائے
ساغر کہاں کا شوق کی تلوار کھائے ہوں
لے ہاتھ میں سبو کہ میں جلو لگائے ہوں

اللہ کا کرم ہی تری ذات ساقیا
بزمِ جہاں ہی بزمِ خرابات ساقیا
لیتا ہوں تیرا نام میں دن رات ساقیا
کیا کہنا تیرا اور تری کیا بات ساقیا
واللہ تیرے قبضہ میں دونو جہان ہیں
تو مہرباں اگر ہی تو کل مہربان ہیں

ہی محوِ جنگ مالکِ تسنیم و سلسبیل
بہرِ سپاہ تیغ کا پانی ہوا سبیل
غصہ میں وار کرتے ہیں جب سرورِ جلیل
اپنے پروں کو دیکھنے لگتے ہیں جبرئیل
گہ ڈر سے دور گاہ محبت سے پاس ہیں
خیبر کا حال یاد جو ہی بے حواس ہیں

کھنچنا بھی اس کا قہر ہی جھکنا بھی ہی ستم
چلاتی ہی اجل کہ غنیمت ہی اس کا دم
جس دن سے آئی چرخ سے تیغِ شہِ امم
یکساں ہی آج تک کبھی تیزی ہوئی نہ کم
یہ وضع دار مثلِ شہِ خوش صفات ہی
کہنے کو دو زبانیں ہیں پر ایک بات ہی

سپر کٹیں۔ جدا سرِ اہلِ ستم ہوئے
تیروں سے پر علیحدہ تیغوں سے دم ہوئے
سب فوج بے نشان ہوئی ٹکڑے علم ہوئے
پوریں جدا جدا ہوئیں نیزے قلم ہوئے
بے آب تیغیں تھیں سیہ بد صفات ہیں
پانی نہ اتنا تھا کوئی ڈالے دوات میں

خوف اس کا شکلِ تیغِ دو دم کام کر گیا
سمجھا حیات مل گئی جو شخص مر گیا
جب یہ تھمی تو غل ہوا دریا ٹھہر گیا
جب یہ چلی تو زیست کا موسم گزر گیا
یہ گرم رو نظر کی طرح سے جو مڑ گئی
سمٹی یہ دھوپ ایک شرر بن کے اڑ گئی

رن پر چڑھا ہی اسپِ شہِ دین دمِ جہاد
چوبیں بنی ہیں خیمۂ گردوں کی گرد باد
ہی طرفہ چیز تیغِ شہنشاہِ خوش نہاد
ہی چرخ پہ ہلال زمیں پر قضا نژاد
کس طرح معجزہ یہ نہیں ساحری نہیں * دریا یہ وہ ہی آب میں جس کے تری نہیں

آتے ہیں اس کو طرفہ خیالات وقتِ جنگ
ہر اک زبان لاکھ سوالات وقتِ جنگ
فقرہ ہر ایک تیغِ دمِ کارزار ہے
جوہر پکارتے ہیں کہ یہ ذوالفقار ہے

زندہ اسی کے دم سے ہے دینِ رسولِ پاک
نام اس کا سن کے ہوتے ہیں اہلِ ستم ہلاک
اُڑتی ہے اس کے خوف سے روئے زمیں پہ خاک
کہتی ہے بار بار قضا روحنا فداک
کیوں ڈر سے آفتاب کا چہرہ نہ زرد ہو
دیکھے جو اس کی آنچ جہنم بھی سرد ہو

ہر ایک فوجِ ظلم و ستم کا نشاں گرا
اللہ رے زورِ تیغ ہر اک پہلواں گرا
کوئی سنبھل کے یاں سے جو اُٹھا وہاں گرا
غل تھا زمین بیٹھ گئی آسماں گرا
چلتی ہے یوں کہ فوجِ ستم پائمال ہے
قائل ہیں اس کے سب کہ قیامت کی چال ہے

کب ظالموں میں شورِ اماں دمبدم نہیں
تھم جائیں ان میں ایک کے ایسے قدم نہیں
ہستی وہ کس کی ہے کہ قریبِ عدم نہیں
دم اس کا بھر رہا ہے لعینوں میں دم نہیں
دریائے فوجِ شام کی کیا کائنات ہے
اس بحر کا تو گھاٹ قریبِ فرات ہے

جس سے ملی یہ اس کے گلے سے قضا ملی
کٹ کٹ گئی جو راہ میں موجِ ہوا ملی
بسمل تھے اس قدر نہ تڑپنے کی جا ملی
جب اُٹھی گر کے چرخِ چہارم سے جا ملی
دہشت سے آفتاب کا بھی زرد رنگ ہے
عیسیٰ کو ہے خبر کہ قیامت کی جنگ ہے

گو سلسبیل کوثر و تسنیم پاس ہے
خالق بجھائے گر تو بجھے ایسی پیاس ہے

اپنی تو پیاس کا مجھے اتنا نہیں خیال
پیاسے جہاں سے جو گئے اُن کا ہی بس ملال
آئے تھے پانی لینے کو عباس خوشخصال
مانع ہوئے یہ غضب کیا۔ ظاہر تھا اُن پہ حال

رایت کی چوبِ خشک نہ تھی تر آہ تھی
سوکھی وہ مشک تشنہ لبی کی گواہ تھی

باتیں یہ کر رہے تھے شہنشاہِ نامدار
باجے بجا بجا کے بڑھی فوج نابکار
فرمایا۔ میرے حکم سے جا۔ اے وفا شعار
وہ وقت آ گیا مجھے تھا جس کا انتظار

ساماں کیا شروع سشہِ ذی شعور نے
دونو قدم رکابوں میں رکھے حضور نے

توصیف فرس لاجواب

آتش نفس بھی ہے یہ فرس باد پا بھی ہے
قدرت خدا کی آگ بھی ہے اور ہوا بھی ہے
صرصر بھی ہے نسیم بھی ہے اور صبا بھی ہے
سرعت کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی ہے

خلقت ہے اس کی کیا متحیر جہان ہے
اضداد جمع ہو گئے خالق کی شان ہے

مانندِ فکرِ شاعرِ خوش فکر دور رو
نازک خرام کوہ وقار اور تیز رو
اُس کو سبک روی کے طریقے ہیں یاد گو
یوں رکھے پاؤں شمع کی ہلنے نہ پائے لو

مثلِ نگہ پھرے۔ یہ کسی پر اثر نہو
محفل میں آ کے جائے کسی کو خبر نہو

صفت تیغ اعدا شکار

ہیں کچھ عجیب تیغ کے حالات وقت جنگ
ممکن ہوئے ہیں سارے محالات وقت جنگ

وقتِ جلال ہی تو جہاں کو ہی اضطراب   گھبرا کے چڑھ گیا ہی بلندی پہ آفتاب
حالت ہوئی ہی غیر ہر اک روسیاہ کی
سب کو جلائے دیتی ہی گرمی نگاہ کی

تپنے لگی وفورِ تب و تاب سے زمی   دریا سراب ہو گئے باقی نہیں نمی
پانی کی ہو گئی ہی سمندر میں بھی کمی   اُف رے مزاج سرورِ والا کی برہمی
نارِ غضب کا سب کو یہ عالم دکھا دیا
صحرا کے ہر گڑھے کو جہنم بنا دیا

ہی طرفہ شان جانِ رسالت پناہ کی   ہو گی نہ یہ شکوہ کسی بادشاہ کی
حالت ہی غیر ڈر سے عدو کی سپاہ کی   ہی شانِ قہر سب کو زمیں رزمگاہ کی
شہ کی نشست کج ہی فرس پر عتاب میں
گردن یہ ایک پاؤں ہی اک ہی رکاب میں

امام حسینؑ زخمی ہو چکے ہیں کوئی انصار و اعزا سے باقی نہیں کہ زعفر جن نمودار ہوتا ہی۔ اور اجازت نصرت چاہتا ہی۔

اُس نے کہا کہ اے اسدِ کبریا کے لال   صدقہ میں آپ کے ہی یہ سب جاہ و جلال
مجھ سے ہو کوئی برسرِ پیکار کیا مجال   ہیں لوگ ساتھ جو کریں لاکھوں کو پائمال
مر جاؤں لڑ کے دھیان یہ ہر بار ہی مجھے
حضرت کا حال دیکھنا دشوار ہی مجھے

جواب امام کا استقلال آمیز جواب و شکر برضائے الٰہی

قربان اُس کے لطف و کرم کے میں ناتواں   اُس کی عطا ہوئی تو دیا میں نے امتحاں
کچھ تجھ سے اپنی پیاس کا عالم کروں بیاں   دل جل گیا ہر ایک نفس ہی شرر فشاں

میرا کلام کیوں نہ صداقت مآل ہو

بند ۱۰۶ (در حال امامؑ)

فضلِ خدا سے معرکے مارے بڑے بڑے
مضموں دلوں پہ نقش کیے جیسے نگ جڑے
میری طرح کسی کی طبیعت بھلا لڑے
مقتول جانتا جو کوئی حرف گر پڑے

میدانِ نظم میں دمِ جنگ و جدال ہے
مضمون غیرِ قتل نہ ہو یہ خیال ہے

بڑھتا ہوں پڑھ کے نادِ علی بہرِ کارزار
مضموں کے دل سے نیزۂ فکرِ رسا ہے پار
صورت دوات سے ہوئی ترکش کی آشکار
پیکاں سے قطرہ ہائے سیاہی ہیں آبدار

ہر مد بنا ہے صورتِ میت کہ دم نہیں
جو دائرہ ہے خون کی تھالی سے کم نہیں

آفت کا رن پڑا ہے جدھر کیجیے نظر
نقطے نہیں کٹے ہوئے سر ہیں ادھر ادھر
زیر و زبر پڑے کبھی یوں تھے نہ پیشتر
مصرعے دو لخت ہو گئے۔ اک لطف ہے مگر

سارے حروف صف کی طرح ہیں ملے ہوئے
بین السطور زخم ہیں گویا کھلے ہوئے

اس وقت غیظ میں ہے جگر بندِ بوتراب
چہرہ سے بار بار سرک جاتی ہے نقاب
ہے سامنے کبھی کبھی بدلی میں آفتاب
کچھ کچھ دکھائی دینے لگا ابروئے جناب

رن میں کھڑے ہیں حیدرِ صفدر کی شان سے
غل ہے کہ ذوالفقار نکلتی ہے میان سے

غصہ میں ہیں حضور جو اُلٹے ہوئے نقاب
طورِ غضب دکھاتا ہے زلفوں کا پیچ و تاب

تفاخرِ شاعرانہ میدانِ نظم کی زبانی اور عجیب تشبیہات

غیظ امامؑ اور حالت [illegible]

پہنچے شہ کے قریب آگیا وہ پاکے کمک — آکے اک تیر کے تلے سے تھما وہ مردک
لی کماں شانہ سے ترکش سے نکالا ناوک — متصل آگئے شبیر جھپکتے ہی پلک

ڈور کا حربہ تھا نیزہ کی سناں بھی کاٹی
چلہ بھی تیر بھی۔ ظالم کی کماں بھی کاٹی

کہا للکار کے لے میاں سے جلدی تلوار — کھینچ کر تیغ دو دم کرنے لگا پیہم وار
ٹوٹی تلوار جو اُس کی تو ہوئی اک جھنکار — دست باچہ ہوا جاتے جو رہے ہوش اک بار

تھا تن و توش بہت اُس کا تو دم بھول گیا
دوسری تیغ تھی ہمراہ۔ مگر بھول گیا

ایک پہلوان لڑنے کو آتا ہے اور شکست کھا کر فنا ہو جاتا ہے۔

ساقی سے خطاب

ساقیا پہلے جو دی تھی وہی شے اب بھی دے
ہو مئے عشق بہت دے مجھے یا تھوڑی دے
حشر تک نشہ رہے جس کا شراب ایسی دے
ہاں تجھے اپنی محبت کی قسم جلدی دے

سہل پینا نہیں اس کا متردد دل ہے
نام لے کر ترا پی جاؤں گا کیا مشکل ہے

طلب بادہ

بادہ نوشانِ محبت کو بڑا نام ملا
بعد اُن سب کے مجھے مدح کا یہ کام ملا
پائی جنت کہ سند خلعت و انعام ملا
جب میں آیا تو فقط دُردِ تہِ جام ملا

تو جو بے ہوش بنا دے تو مجھے ہوش آ جائے
تو جو دے بادۂ سر جوش مجھے جوش آ جائے

تو ہی ساقی مرا ہے ساقیِ کوثر ترا نام
خم کے خم آج پلا دے مجھے دے جام پہ جام
کام پینا ہے مرا اور پلانا ترا کام
رُوح کو چین ہو دل کو مرے آئے آرام

تا قیامت یہ رہے عالم میں ترا دَور۔ پلا
جس قدر نشہ زیادہ ہو کہوں اور پلا

پارسا بنتِ عنب کو بھی کہیں دیکھتے ہیں
سیرِ گلزارِ فلک گوشہ نشیں دیکھتے ہیں
حکم تیرا جو نہیں۔ پھر کے نہیں دیکھتے ہیں
پیتے ہیں جو مئے دُنیا وہ زمیں دیکھتے ہیں

نشۂ بادۂ کوثر کو سوا کر ساقی
دے مئے خمِ غدیر اُس میں ملا کر ساقی

بزم میں دیکھ کے اندازِ کرم بیٹھ گئے
شوق میں جھوم کے ساقی کے قدم بیٹھ گئے
ذوق پینے کا جنھیں تھا وہ بہم بیٹھ گئے
ایک گوشہ کی طرف کہہ کے یہ ہم بیٹھ گئے

جام چلنے کو ہے سب اہلِ نظر بیٹھے ہیں ✽ آنکھ ساقی نہ چُرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں

عرض کی ایک بلاکش کا کہا کرتی ہوں
بھائی۔ اماں کی وصیت میں ادا کرتی ہوں

نزع کے وقت یہ فرما گئی تھیں وہ خوش خو — بے خطا رن میں بہے گا ترے بھائی کا لہو
آئے جب رخصتِ آخر کو وہ میرا مہ رو — ذبح کا وقت ہے نزدیک سمجھ لینا تو
جب چلے مرنے وہ محبوسِ بلا اے زینب
چوم لینا مرے بچہ کا گلا۔ اے زینب

صفت شمشیر حسین

آب ہے سیلِ فنا دم ہے اک آفت اس کا — جا ہے امیدِ قضا ہے درِ دولت اس کا
کم سمندر سے نہیں جوشِ طبیعت اس کا — کھنچنا اک قہر ہے جھکنا ہے اک آفت اس کا
خوف سے اس کے فلک خم ہوا خم ایسا ہے
ملک الموت کی ہمدم ہوئی دم ایسا ہے

چال وہ قہر کی ہے جس سے زمیں ہل جائے — مردے اُٹھنے لگیں ہر گور کی منزل ہل جائے
رُعب ایسا ہے کہ طاقت نہیں بسمل ہل جائے — وہ چمک آنکھیں جھپک جائیں ہر اک دل ہل جائے
تیزی ایسی ہے کہ جو برق کو بھی مات کرے
غصہ ایسا کہ زباں کاٹ لے جو بات کرے

صاف کہتی ہے نہ کیونکر ہمہ تن ناز ہوں میں — طائرِ جانِ عدو کو پر پرواز ہوں میں
ایک قرآن ہے اور دوسرا اعجاز ہوں میں — وہ خدا کا ہے کلام اور خدا ساز ہوں میں
ذکرِ دیں اس میں ہے میں دیں کی شیدائی ہوں
اُسمیں احکام ہیں اور حکم سے میں آئی ہوں

امام حسینؑ عالمِ یاس میں کھڑے ہیں کوئی مونس و یاور نہیں کہ قاصدِ صغرا نمودار ہوتا ہے آپ اُس سے اپنی دُور اُفتادہ بیٹی کا حال دریافت فرماتے ہیں قاصد امام حسینؑ کو دیکھ کے حیرت انگیز لہجہ میں اظہارِ تاسف کرتا ہے اور پھر حالِ صغرا کہتا ہے

چوم کر پائے مبارک وہ ہوا یوں گویا — میں نہ پہچان سکا آپ کو یا شاہِ ہدیٰ
تھوڑے دن گذرے مدینہ میں ابھی دیکھا تھا — ریشِ اقدس میں سفیدی ہے عیاں اے آقا
بہت اُترا ہوا ہے چہرۂ انور حضرت
سینکڑوں زخم ہیں اور خون میں ہیں تر حضرت

دل تڑپنے لگا فرمایا کوئی خط ہے لا — با ادب اُس نے قریب آکے جو مکتوب دیا
بولے شبیرؑ کہ مشکل سے پڑھا جائے گا — اشک آنکھوں میں ہیں اور ضعفِ بصارت ہے سوا
ہے یہ نامہ غم و حسرت کی نشانی بھائی
حال کچھ اُس کا بیاں کر دے زبانی بھائی

سر جھکا کر کہا اُس نے کہ ہیں بیمار بہت — اب نقاہت سے ہوا ہو گئی ہیں زار بہت
ہو گئیں گھر بھر سے جدا بڑھ گیا آزار بہت — سب کی مشتاق ہیں ہے حسرتِ دیدار بہت
منتظر آنے کی ہیں در پہ کھڑی رہتی ہیں
تپ جو بڑھتی ہے تو بے ہوش پڑی رہتی ہیں

مکتوبِ صغرا لے کے حضرت خیمہ میں تشریف لائے سب بیبیوں کو حال سنایا اور پھر آمادۂ رزمگاہ ہوئے۔ کہ جنابِ زینب نے روک لیا تاکہ وہ ایک وصیتِ جنابِ فاطمہ پوری کریں

بولیں صدقے گئی گھوڑے سے اُتر آؤ ذرا — مجھ کو یاد آگئی اک بات بہت خوب ہوا
اُترے گھبرا کے فرس پر سے شہنشاہِ ہدیٰ — بیٹھ جاؤ جو کہا خاک پہ بیٹھے مولا

آتش افروز کوئی چیز نہ تھی پانی میں
رنگِ گل کا جو کٹا آگ لگی پانی میں

ایسی مستانہ روش بادِ بہاری آئی
آنکھ نرگس کی کھلی باغ میں آہٹ پائی
اُلجھے پھولوں میں قلم سبزہ میں ٹھوکر کھائی
شاخیں جھومیں کہ ہر اک نخل نے لی انگڑائی

بلبل اس درجہ ہوئی شاد کہ چلّانے لگی
سبزہ لہرانے لگا نہر میں موج آنے لگی

کتنی دلچسپ ہی سبزہ کے نکلنے کی بہار
ہی زمیں باغ کی گویا کسی نوخط کا عذار
کیوں صبا دوڑتی پھرتی ہی میانِ گلزار
سبزہ خوابیدہ ہی کہدے کوئی نرگس ہشیار!

بے خبر ہی یہ عیاں ہی نظرِ بلبل سے
آنکھیں بس سینکتی ہی آتشِ رنگِ گل سے

کچھ عجب صورتیں غنچوں کی ہیں بھولی بھولی
منع بلبل نے کیا پھر کسی نے جو لی
جو فقیر آگیا بھر لی زرِ گل سے جھولی
بولی نرگس تجھے کیا بحث ہی تو کیوں بولی

بات جاتی رہے یہ حسنِ بیاں کھل جائے
کہیں ایسا نہو سوسن کی زباں کھل جائے

وہ ہوا باغ کی وہ ابر کا آنا جانا
حسن اور عشق کا ہر ایک جو ہی دیوانا
قصہ بلبل کا کہیں گُل کا کہیں افسانا
کثرتِ گُل یہ ہی مشکل ہی خزاں کا آنا

رستے بند ہیں پھولوں کا مزا تازہ ہی
دہنِ غنچہ ہی یا باغ کا دروازہ ہی

یا حسین ابنِ علی آپ کا ذاکر ہوں میں

بند ۱۰۹ (در حالِ امام حسینؑ)

امام حسینؑ کی مع انصار میں تشریف آوری

نکلے خیمہ سے مسلح جو شہنشاہِ عرب
اُٹھے سجادوں سے تیغیں لیے انصار ہی سب

بعد تسلیم پھرے گرد تمام اہلِ عرب
شاہ کے ساتھ بڑھے سیر کو وہ پیش و عقب

سب ہنسے آئی نظر ایسی فضا مقتل میں
گلشنِ فاطمہ کے پھول کھلے جنگل میں

صبح کے دلفریب مناظر۔ اور کیفیت چمن۔ یہ چند بند اُن تمام شاعرانہ خوبیوں سے مملو ہیں جن پر مغربی خیال کے حضرات کو وجد آتے ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ رشید کی طبیعت کو قدرتی مناظر سے کس قدر حیرت انگیز لگاؤ تھا۔

وہ سماں صبح کا اور جانوروں کا وہ غل
جب ہوا آئی جھٹکنے لگا زلفیں سنبل

پھول جو کھل رہے ہیں نغمہ سرا ہی بلبل
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ نسیم اوس میں ڈوبے ہوئے گل

وہ ہوا دشت میں آئی کہ چمن پھول گئے
پیاس دو روز کی سب غنچہ دہن بھول گئے

اے خوشا وقت کہ عالم میں ہے سامانِ بہار
پھر سنواری گئی ہے زلفِ پریشانِ بہار

سب مہیا ہیں وہ چیزیں جو ہیں شایانِ بہار
صحنِ گلشن میں ہیں گل دست و گریبانِ بہار

پھول سب کھلنے لگے شاخ ہر اک پھلنے لگی
گر کے جب اوس تھمی سرد ہوا چلنے لگی

مدد ابر سے رکھتا ہے روانی پانی
جا بجا عکس سے سبزے کے ہے دھانی پانی

کچھ جو کہتا ہے تو موجوں کی زبانی پانی
جس طرف دیکھو نظر آتا ہے پانی پانی

جب جھپٹتے ہیں وہ فوجوں پہ تو فرماتی ہیں ماں
واہ واہ اے مرے بچو! تمہیں خالق کی اماں
کیجیو جان لڑا کر مددِ شاہِ زماں
دودھ میں بخش چکی تم کو مبارک ہو جہاں

بس دعا مانگتی ہوں فضل خدا کا ہو جائے
جس لیے تم گئے ہو کام وہ پورا ہو جائے

فوج اعدا پہ اُن بچوں کی دہشت۔ ابنِ سعد کا خطاب اور پہلوانوں کا جواب۔

پہلوانوں سے ابنِ سعدِ لعیں نے یہ کہا
فوج تو بھاگ گئی بے خبر۔ ہوا ہے تمہیں کیا
دو نوان چھوٹے سے بچوں سے نہیں کم نے دغا
گود میں ان کو اُٹھا لاؤ جو رکھتے ہو حیا

وقت آ جائے تو رستم سے بھی لڑ لیتے ہیں
لوگ تو گھیر کے شیروں کو پکڑ لیتے ہیں

بولے ہاں لڑتے ہیں جب ہو [illegible] سرِ دلیر
پہلے جو بھاگ گئے ہوئے جاتے ہیں اُن کو بھیر
تو نکل فوج سے ہم ساتھ ہیں چل کر انھیں گھیر
ہم ہیں روباہ سے کم وہ اسد اللہ کے شیر

کفر و اسلام میں اوّل سے کبھی میل نہیں
جنگ ان بچوں سے دشوار ہے کچھ کھیل نہیں

کہہ کے یہ زلفیں مغفر ہوا دل اور اداس
تھا عیاں دل کے دھڑکنے سے غضب کا ہے ہراس
آنکھیں پرآب تھیں چہرہ سے ٹپکتی تھی یاس
دیتی جاتی تھیں پہننے کے لیے ان کو لباس
دھیان آیا گل امید ہے اب کھلنے کو
کمریں بندھوا کے کھڑی ہوگئیں خود ملنے کو

صفت رہوار

دوڑی یوں ساتھ ہوا گاہ گری گاہ تھمی
یہ سبک چلنے لگے گرد سموں پر نہ جمی
خاک کب اڑتی تھی تعظیم کو اٹھتی تھی زمی
دیکھنے والوں کی سانس آنے میں تھی کمی
راہ میں طائر وہم ان کو نہیں پا سکتا
تیز رو ہیں کہ پسینہ بھی نہیں آسکتا

سر قلم کرنے میں بچوں کو بہت ہے تعجیل
شاہزادوں کا ہے حکم اس کی ہے واجب تعمیل
ہوتی جاتی ہے جب و رہت فنا فوج ذلیل
دونوں ہاتھوں سے ذرا کام کریں عزرائیل
ہیں اگر ہوش پراگندہ درستی نہ کریں
تیز دستی کا یہ ہنگام ہے سستی نہ کریں

فرزندوں کے دلیرانہ حملوں پر جناب زینب کا اظہار اطمینان

آئی تھیں بیٹوں کو پہنچانے جو زینب غمگیں
بولیں فضہ سے کہ لو بھاگتے پھرتے ہیں لعیں
شور اعدا جو سنا اپنی جگہ سے اٹھیں
کہہ کے یہ بنت علی آگئیں پردے کے قریں
آرزو تھی کہ یہاں لاشہ یہ لاشہ دیکھوں
میں تو دونوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھوں

بولیں جب دم وہ پھرے لے کے نشان جاں سپر
اب تو پیچھے پڑے ہیں جھاڑ کے پنجے مرے شیر
دیکھو دم بھر میں کیے دیتے ہیں لاشوں کے ڈھیر
سب بزرگوں کے تصدق میں ہوئے ہو اور دلیر
ہوگئے ہاتھ قوی نام جو دو نیں سے لیے ✱ دونوں بچوں نے جوانوں سے علم چھین لیے

اپنے بابا کی طرح یہ بھی ہیں خالق کے ولی
ہوگا اک حشر بپا آن کے جو تلوار چلی
رتبہ ان دونوں کا ہے سارے زمانہ پہ جلی
علمِ احمدِ مختار کے حامل ہیں علی

عزت اس سبز پھریرے سے بڑھے جاتے ہیں
حضرتِ خضر عمامہ کے لیے چاہتے ہیں

بڑھ گئے دل علم اس شان سے باہر آیا
سرِ شبیر پہ عباس کیے تھے سایا
فوج اللہ و پیمبر کو مسلح پایا
واں سے سبقت ہوئی حکم آپ نے بھی فرمایا

سینے تانے ہوئے سب صاحبِ شمشیر بڑھے
وجہ غصہ کی ہوئی زخم لگے شیر بڑھے

جا کے ایک ایک نے میدان میں کی خوب وغا
خود گئے خلد میں اور نار میں فوجِ اعدا
لڑکے مسلم کے یتیموں نے بھی کی رن میں قضا
جلد گھر میں گئے جانِ دلِ بنتِ زہرا

کہہ کے سب حال کہا شہ سے گزارش کیجیے
وقت ہے وعدہ وفائی کا سفارش کیجیے

کہا زینب نے کہ ہاں مجھ سے بھی لو رخصت
جلد سامان کرو چاہیے بیشک عجلت
کرو مظلوم حسینؑ ابنِ علی کی نصرت
آج تم زور سے تلوار کے لے لو جنت

مختصر کہتی ہوں جاتی رہے یا جان رہے
وضع کا اپنے بزرگوں کی ذرا دھیان رہے

سنتی ہوں رن میں کئی لاکھ ہے فوجِ ناری
تم بھی دونوں مددِ شہ کی کرو تیاری
بس اسی دن کے لیے تھی مری محنت ساری
آج کے مرنے کو مرنا نہ سمجھنا واری

دیکھو قرآں میں شہیدوں کا بڑا رتبہ ہے + پاس اللہ کے ہیں رزق انھیں ملتا ہے

بعد شہادت انصار عون و محمد ماں سے سفارش رخصت چاہتے ہیں اور وہ بخوشی نصرت حسین کے لیے اجازت دیتی ہیں بچوں کے دل بڑھاتی ہیں اور مرتبہ شہادت بیان فرماتی ہیں۔

چھوٹے صاحبزادے کی تقریر اور تقسیم علم و تیغ

کی یہ چھوٹے نے جسارت کہ کہا اے اماں
ہیں نبی زادے وراثت تو ہماری ہے عیاں
سچ ہیں بے شبہہ کہیو آپ نے جو امر بیاں
نانا دادا کے دکھاتے ہیں ہمیں آج نشاں
یہ بڑے ہیں انھیں لشکر کا علم دیدیجے
ہم لڑیں فوج سے اک تیغ دودم دیجیے

اسی سلسلہ میں جناب زینب کی مزید تقریر

اک تعجب ہوا کی آپ نے حسرت سے نظر
دفعتاً حال ہوا ہو کوئی جیسے ششدر
ہاتھ مارا کبھی سینہ پہ کبھی زانو پر
بولیں میں سمجھی تھی لینا ہے علم ردو کر
اب کھلا مرتبہ میں سب پہ یہی غالب ہیں
ذوالفقار اسد اللہ کے یہی طالب ہیں

رنج ظاہر ہو وہ چشم اور وہ ابرو کیوں ہیں
ہے خوشی مرنے کی تو آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں
کیوں پریشان ہو بکھرے ہوئے گیسو کیوں ہیں
غم ہے کیا باتوں میں یہ درد کے پہلو کیوں ہیں
قاسم و اکبر و عباس کو سمجھا دونگی
پہلے ان سب کے رضا مرنے کی دلوا دونگی

امام حسین خیمہ میں تشریف لاتے ہیں جناب زینب علم سج کے دیتی ہیں۔ اور عباس علمدار باہر لے کے آتے ہیں

گفتگو کچھ ابھی باقی تھی کہ آئے شہ دیں
پھر کے فرزندوں کی جانب سے علم سجنے لگیں
اور اشارہ سے کہا جا یہ ٹھہرنے کی نہیں
دے کے بھائی کو نشاں بولے شہ عرش نشیں
کمریں جراروں کی اے ماہ لقا بندھواؤ
واں صفیں بندھ گئی ہیں تم بھی پرا بندھواؤ

کرکے تسلیم چلا وہ دل و جان حیدر
تھی وہی شان علی اور وہی تھے تیور
در پہ حاضر ہوئے انصار پہنچی جو خبر
لے چلے آپ علم کرکے سلامی باہر
فوج اسلام کی تسلیم کو آمادہ تھی ❋ فضہ پردہ کو اٹھائے ہوئے استادہ تھی

ہی غضب میرا خجالت سے نہیں اُٹھتا سر
سامنے سب کے کہا تم نے جو تھا مدِ نظر
کیا تعجب ہی جو فضہ نے کہا ہو جا کر
ہوگئی ہوگی اُنھیں علمِ امامت سے خبر
مجھ کو شرم آتی ہی کیا سامنے جاؤں شہ کے
بات میری گئی تم چھپٹ گئے بچہ کہہ کے

لاکھ سمجھایا تمھیں کچھ نہ ہوا آہ صد آہ
باتیں یہ خوب نہیں دل میں سمجھتے ہیں واہ
ہیں مشیت سے خدا کی شہِ والا آگاہ
مُنہ سے اب نام علم کا نہ نکالو للہ
جتنے ہیں فخرِ شجاعانِ عرب مانگیں گے
رشتہ جن جن کو نبی سے ہی وہ سب مانگیں گے

عذر کیا اُن سے کیا جائے گا کچھ بتلاؤ
ایسے بچہ نہیں۔ لازم ہی مجھے سمجھاؤ
ہی علم ملنے سے بہتر کہ شہادت پاؤ
سُرخ رُو خوں میں ڈوبے ہوئے گھر آؤ
پاس ایک ایک کا کس طرح کیا جائے گا
عہدہ یہ ایک ہی کس کس کو دیا جائے گا

گوشۂ چشم سے کرتی تھیں جو غصہ کی نظر
ہاتھ جوڑے ہوئے وہ کانپ رہے تھے تھر تھر
یہ خبر سُن کے چلی آئی سکینہ مضطر
آبدیدہ انھیں دیکھا تو کہا گھبرا کر
شاہ کو اُن سے ہی عشق اور وہ عاشق شہ کے
ہم دلا دیں گے تمہیں اپنے چچا سے کہہ کے

مسکرا کر کہا زینب نے کہ۔ ناجی۔ جی نا
وہ بُرا مانیں گے ہرگز نہ چچا سے کہنا
آبدیدہ ہیں تو کیا رو دیں گے تو کیا ہوگا
تم تو ناداں ہو سمجھتی نہیں مطلب ان کا
ظاہرا گو علمِ شیرِ خدا مانگتے ہیں ✱ اسی پردہ میں یہ مرنے کی رضا مانگتے ہیں

جنابِ زینب کے غصہ کی وجہ سے دونو صاحبزادہ سہمے ہوئے کھڑے ہیں کہ جناب سکینہ آتی ہیں اور عہدہ علمداری کے لیے جنابِ عباس کی سفارش کا وعدہ فرماتی ہیں مگر جنابِ زینب انکار فرماتی ہیں۔

عون و محمد کی گفتگوئے علمِ حسینی لینے کا اشتیاق و اظہار جناب زینب کی غصہ آمیز تقریر

اذن وہ دیں تو حضورِ شہِ ذیشاں چلیے
پھر ہوئے باغِ جناں خرّم و فرحاں چلیے
پہلے سے فکر ہے جاہ و حشم بھی کیجے
گر مناسب ہو تو کچھ ذکرِ علم بھی کیجے

دونوں یہ کہہ کے جو گھر میں گئے بولی ہاں آؤ
کہو کیا کام ہے کیوں آئے ہو تم جلد بتاؤ
عرض کی دونوں نے دل کہتا ہے ہرگز نہ چھپاؤ
ہم علم لینے کو آئے ہیں کہا باہر جاؤ
مثل جعفر ہوئے یا جعفرِ طیّار ہوئے
واہ وا خوب علم لینے پہ تیار ہوئے

لاکھ صدموں میں گرفتار ہوں میں زار و حزیں
ہے اگر فکرِ علم تم کو تو لو جاکے کہیں
اب مرے دل میں محبت کا کہیں نام نہیں
کوسے تم دونوں کو کوئی تو کہوں میں آمیں
جائیں جائیں تو علم لینے کا قصہ جائے
بات رہ جائے جو اس وقت اجل آ جائے

مجھ کو دینے کے لیے صدمہ و غم کیوں آئے
چھوڑ کے خدمتِ سلطانِ امم کیوں آئے
دل میں پچھتاتے تو اب ہوگے کہ ہم کیوں آئے
رنج ہوتا ہے مجھے ذکرِ علم کیوں آئے
اب ہے ضد مجھ کو کہ تم دونوں کی ضد دیکھوں گی
بھائی دیں گے بھی اگر اب تو نہ دینے دوں گی

جناب زینب صاحبزادوں سے عدمِ استحقاقِ علمداری کی وجوہ بیان فرماتی ہیں

لو سنو مجھ سے وراثت کا اگر ہے دعوے
تم کو کیا بیٹھے ہیں جعفر کہ تمہارے بابا
منتقل کر گئے خود شاہِ رسل یہ عہدا
دلبرِ حیدرِ کرار ہیں سلطانِ ہدا
وہ بھی وارث ہے طلب بھی نہ اگر پاویں گی
گر خدا چاہے گا عباس کو دلواؤں گی

کربلا میں دہہم ماہِ محرم آئی
بند ۱۰۰ (در حالِ عون و محمدؑ)

آمد بہار اور پردۂ شاعری میں کیفیت بین

نہ کسی نے خبرِ حالتِ نکہت مبدلی
باغِ عالم کی ہوا اور ہوئی رُت بدلی
شرطاً آپس میں بہار آنے کی سب نے بدلی
بوندیاں پڑ رہی ہیں چھائی ہوئی ہے بدلی
خشک گل تر ہوئے پیروں کو جواں کرتا ہے
آبیاری چمن آرائے جہاں کرتا ہے

نام ساماں ہے اب بے سر و سامانی کا
باغبانوں کو یہ موقع تھا نگہبانی کا
ٹوٹے فوارے بھی اور زور بڑھا پانی کا
نام گلزار میں رکھتے نہ پریشانی کا
ہوں میں زینت کا سبب صاف یہی کہتی ہے
آج کل پتوں میں سنبل کے چھپی رہتی ہے

باغباں کو ہوئیں مشکلیں آسانی میں
ہے عبث گیسوئے سنبل کی نگہبانی میں
پھول بہتے ہیں حبابوں کی جگہ پانی میں
لاکھ جمعیتِ خاطر ہے پریشانی میں
کشتی آ کے کبھی تھم سکتی نہیں دھارے پر
گر کے گل شاخ سے تیرے ہے فوارے پر

حسین کو انصار ان کا لیے بعد دیگرے فائز بہ شہادت ہوتے دیکھ کر جناب زینب کے فرزندوں کو بھی خیال نصرت حسین پیدا ہوا اور آپس میں یوں ہمکلام ہوئے

رنگ یہ دیکھ کے گھبرا گئے زینب کے پسر
چل کے اماں سے کہو شہ سے کہیں بلوا کر
مشورہ کرنے لگے وہ گلِ باغِ جعفر
ہم کو مل جائے رضا چلیے فدا ہوں شہ پر
آج ہر اک گلِ اُمید چمنے گا بھائی
دیکھنا کوئی ہماری نہ سُنے گا بھائی

کہا چھوٹے نے بڑے بھائی سے ہاں چلیے
کہیے تو دیکھیے کیا کہتی ہیں اماں چلیے

ساقی نامہ

ساقیا اب تو میں اک جام لبالب لونگا | ایک قطرہ بھی ہوا کم تو بھلا کب لونگا
جس طرح پہلے دیا ہی مجھے پھر اب لونگا | جام کیا شے ہی خُم و شیشہ سبو سب لونگا

ساقیا تجھ سا سخی خلق میں زنہار نہیں
جانتا ہوں کہ تجھے دینے میں انکار نہیں

دم بدم صورتِ دریا کرم ہاتھ بڑھے | سیکڑوں جام چڑھا جانے سے تیوری چڑھے
نزع میں نشہ سے مملو ہوں یہ آنکھوں کے گڑھے | ہم خدا ہیں نہ پیمبر ہیں کلمے نہ پڑھے

بعد اللہ و نبی ایک تجھے مانتے ہیں
دین اپنا تجھے ایمان تجھے جانتے ہیں

اس کے پینے سے نہیں رہتی شکایت کوئی | کہ پہنچتی نہیں عصیاں سے اذیت کوئی
نہ پیے یہ تو نہ مقبول ہو طاعت کوئی | اس سے بہتر نہیں دنیا میں عبادت کوئی

سجدہ ہر بار کروں مطلبِ دل پا جاؤں
دیے جا جام میں تسبیح پہ گنتا جاؤں

شہادتِ امام اور گریہ جناب زینبؑ

ہو گئے ذبح شہِ دیں گئی ہر سمت خبر | ہو گئے سب حرمِ پاک زیادہ مضطر
گھر سے مقتل کو چلیں شہ کی بہن ننگے سر | بند آنکھیں کرو ایک شخص پکارا بڑھ کر

آبرو جاتے ہو غالبِ ہر غالب کی
بیٹی آتی ہی علی ابنِ ابی طالب کی

پہنچی نزدیک جو شبیر کے وہ شیدائی | رو کے چلائیں کئی مرتبہ بھائی بھائی
ہائے چلتی رہی ہیں تم نے شہادت پائی | تم کو گھیرے ہوئے ہے بیکسی و تنہائی

نئے انداز سے یہ دشمنِ دیں لوٹتے ہیں ÷ سر بھی تن پہ نہ رہا یوں بھی کہیں لوٹتے ہیں

اسپ پہچان گیا عزم شہنشاہ انام
کر لیا قصد کہ پامال کرے فوج شام
کام وہ کیجیے جس سے خلق میں رہ جائے نام
یوں چلوں چلتی ہے جس طرح سے حیدر کی حسام

شیر کی طرح قریب صف ہیجا پہنچا
ایک ہی جست میں تا فوج ستم جا پہنچا

تلوار کی تعریف

یہ چلی جن پہ وہ جینے کی قسم کھانے لگے
ابر وہ جس سے قضا ابر صفت چھانے لگے
آب ایسی ہے کہ ہر بحر میں موج آنے لگے
چمک ایسی ہے کہ دل برق کا تھرانے لگے

کب کسی دل میں دم جلوہ گری تھمتی ہے
کہیں شیشہ میں اتر کے یہ پری تھمتی ہے

نور عین علی اس وقت جو ہے مائل حرب
وہی غصہ ہے بعینہ ہے انھیں کی ہر ضرب
جسلد چھیننے کے لیے مہر بھی ہے عازم غرب
زلزلہ یہ نہیں ہے گاؤ زمیں کو بھی ہے کرب

کروٹیں خوف سے رہ رہ کے بدلتی ہے زمیں
یا علی کہہ کے ہر اک بار سنبھلتی ہے زمیں

رہتے ہیں جلنے میں قلعۂ خیبر کی طرف
ان میں ہے شور کہیں لٹ رہے ہیں شاہ نجف
جس نے کاٹے پر جبریل الٹ دی ہر صف
جس سے جانیں ہوئی ہیں مرحب و عنتر کی تلف

خوف اس مرتبہ ہے جان چلی جاتی ہے
اسی تلوار کے چلنے کی صدا آتی ہے

فوجیں ہر ضرب پہ ہلتی ہیں کہ ہلتی ہے زمیں
گرد اٹھتی نہیں اس طرح کہ اٹھتی ہے زمیں
پر بچھاتے نہیں جبریل کہ کٹتی ہے زمیں
غل فرشتوں میں ہے پھر آج اُلٹتی ہے زمیں

اس قدر مہر کو ہے خوف کہ منہ پھیرے ہے * آسماں چھپنے کو چار طرف گھیرے ہے

شہ نے فرمایا کہ اس وقت جو اکبر ہوتے
اے بہن اس سے سوا اشکوں سے منہ کو دھوتے
اور اس طرح سے سر پیٹ کے ہم تم روتے
یا گلا کاٹ کے خود جانِ حزیں کو کھوتے
مل گئی خاک میں کیا چاند سی صورت اُن کی
حشر تک ہم کو نہ بھولے گی محبت اُن کی

زور ہاتھوں میں علی کا مگر اُف رہی غربت
وہی سیرت مرے نانا کی وہی سب صورت
کس قدر ہو گئی اٹھارہ برس میں شہرت
جو قبا پہنی ہوئی بیاہ کا گویا خلعت
کیسی پائی تھی رسولِ دو جہاں کی آواز
کان میں آ رہی ہے اُن کی اذاں کی آواز

نور آنکھوں کا اُجالا وہ مرے گھر کا تھا
خانداں میں مرے جو تھا وہ بہن یکتا تھا
اس سبب سے نہیں کہتا کہ وہ مرا بیٹا تھا
گو حسیں سب تھے مگر یہ تو نجانے کیا تھا
اک پیمبر سے سوا اپنا پسر دیکھ لیا
سنتے تھے حضرتِ یوسف کو مگر دیکھ لیا

خیمہ سے برآمد ہونا حضرت کا

شاہِ دیں روتے ہوئے خیمہ سے آئے باہر
کی نظر چار طرف پر کوئی آیا نہ نظر
چور زخموں سے بدن سیکڑوں صدمے دل پر
ضعف میں گھوڑے کے نزدیک کھڑے تھے ششدر
ایسے شاہنشہ دیں بے کس و بے یار ہوئے
تھامی زینب نے رکاب آ کے تو اسوار ہوئے

صفت اسپ خوش لجام

جم کے بیٹھے تو دلِ خستہ نے راحت پائی
شہ کو یاد آ گیا وہ قوتِ بازو بھائی
پاؤں میداں میں بڑھایا تو قیامت آئی
جوش میں لانے لگا اور غمِ تنہائی
آ گیا دھیان کہ تھوڑی سی سزا دوں سب کو * زنگ پیری میں جوانی کا دکھا دوں سب کو

پھل سے شمشیر کے ظاہر ہے کہ قبضہ میں ہے نہر | لہر ہے سبز پھریرے کی کہ سبزہ کی لہر

شوق میں دور سے غلماں بھی اسے چومتے ہیں
جب ہوا جاتی ہے جنت کے شجر جھومتے ہیں

انصارِ امام شہید ہو چکے ہیں لشکرِ اعدا سے مبارز طلبی کر رہا ہے آپ خیمہ میں بہرِ رخصت جاتے ہیں۔

دل سے فرمایا غم و رنج کے دفتر کھولیں | جن سے ہم چھٹ گئے جی کھول کے ان کو رو لیں
چھائی ہے گردِ الم آنسوؤں سے منہ دھو لیں | موت نزدیک ہے اب بہنوں سے رخصت ہو لیں

حالِ اندوں کا ہے اندوہ سے کیا دیکھ آئیں
سب کو پھر ایک نظر چل کے ذرا دیکھ آئیں

آرزو تھی کہ سرِ تربتِ اصغر روتا | کبھی قاسم کے لیے گہ پئے اکبر روتا
بہرِ عباسِ علمدار یہ مضطر روتا | ملتی مہلت تو ہر ایک قبر بنا کر روتا

رہتا مشہور سدا خلق میں وہ غم کرتا
ہاتھ بے کار نہ ہوتے تو میں ماتم کرتا

کہہ کے یہ اور پریشاں ہوئے سلطانِ عرب | آ کے خیمہ میں صدا آپ نے دی اے زینب
کہو بیبیوں سے کہ ملنے کے لیے آئیں سب | کریں عابد سے بیاں دل میں جو کچھ ہے مطلب

اب امامت انھیں ہونے کو ہے ہشیار کریں
قصد ہے اپنی سکینہ کو ذرا پیار کریں

دوڑیں سیدانیاں خیمہ میں ہوا حشر بپا | سب کی سب آئیں قریں برہنہ سر برہنہ پا
شورِ ماتم ہوا جب دینے لگے شہ پرسا | غم یہ تھا زینبِ مضطر کے نہ تھے ہوش بجا

پاؤں پر جھک گئیں الفت سے دعائیں دے کے
گرد پھرنے لگیں بھائی کی بلائیں لے کے

ہوا دا شرطِ محبت تو جزا ملتی ہی

بند ۸۵ (در حالِ امام حسینؑ)

علمِ سبز حسینی کا ذکر کرتے ہوئے آپ ہیں اور اندازِ بیان قابلِ ملاحظہ ہی

آگیا خیمہ سے باہر شہِ مرداں کا خلف
لشکرِ شام میں بجنے لگے ہر سو نَے و دف
سب کو جوش آگیا جرار بڑھے تیغ بکف
فوجِ اسلام میں تکبیر ہوئی بن گئی صف
شیروں کے نعرۂ شیرانہ سے رَن ڈول چکا
پسرِ شیرِ خدا سبز علم کھول چکا

علمِ شاہ کی میدان میں ہی طرفہ بہار
آنکھیں ہیں بند گرے پڑتے ہیں یاں اہلِ دوال
تجلی گرتی ہی لعینوں پہ چمک کے ہر بار
صبح کے وقت کا ہونے لگا ہر جا اظہار
دم بدم یاں سے جو پنجہ کی ضیا جاتی ہی
دھوپ جنت کے درختوں پہ نظر آتی ہی

یہ علم فوجِ حسینی کے چمن کی ہی جان
پانچ پتی کا کھلا پھول یہ ہوتا ہی گماں
باغِ اسلام کی رونق ہی یہ پنجہ کی ہی شان
گلِ صد برگ کی مانند سنہری ہی نشان
غازہ رنگ اس کا بنا حور کے چہرہ کے لیے
پھول کھلنے لگے ہر باغ میں سہرے کے لیے

پوچھا پھبن کو نہ ہمراہ ہوا دے لی
گل و بو کے لیے تشبیہ ہی محملِ لیلی
گرد کی پاک کہ تھی پانی کی چادر میلی
پھول کھلنے کی خبر آئی کہ خوشبو پھیلی
علمِ شہ کے پھریرے کی یہ زیبائی ہی
عطر ملنے کے لیے فصلِ بہار آئی ہی

اس کا حامل ہی بہارِ چمنستانِ دھر
ہیں قوی ہاتھ کہ بے تیغ ابھی چھین لے شہر

ایک پہلوان جنگ کو آتا ہے اور جناب علی اکبر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے

بڑھے تو مورچے لشکر کے دم بدم توڑے
ہزار ہا سرِ کفار کم سے کم توڑے
پھریرے پھاڑ کے پھینکے ادھر علم توڑے
دکھا دی بت شکنی مثلِ جد صنم توڑے
خدا کے بعد ہیں ہم سب کو یہ بتاتے ہیں
ہر ایک وار پہ تکبیر کہتے جاتے ہیں

یہ سن کے آئی حیا تیغ لی۔ بڑھا جلاد
گزند ان کو نہ پہنچی تو یوں کیا ارشاد
غضب کے ہاتھ لگانے لگا ستم ایجاد
تجھے تو کچھ ہنرِ جنگ خاک بھی نہیں یاد
عیاں ہے صاف کہ دونوں پہ خوف طاری ہے
فرس کو روک سنبھل۔ اب ہماری باری ہے

دغا سے دل ترا نامرد ہٹ نہ جائے کہیں
زرا جھلم نہ ہٹا چہرہ کٹ نہ جائے کہیں
نظر نہ پھیر ادھر دھیان بٹ نہ جائے کہیں
جھجک کے تیغ سے گھوڑا الٹ نہ جائے کہیں
فرس کا ہے پس و پیش ایک یوں سمٹتا ہے
بڑھ آگے خوف سے کیوں دبکے پیچھے ہٹتا ہے

بڑھے یہ کہہ کے لگے چلنے جانبین سے وار
لعیں کی انگلیاں کٹ کٹ کے گرتی تھیں ہر بار
گھٹا یہ زور ہوا دست پاچہ ظلم شعار
ہوا یہ حال لگی گرنے ہاتھ سے تلوار
کہا انھوں نے جو زخمی ادھر کلائی ہوئی
یہی تھی ضرب ید اللہ کی بتائی ہوئی

⁂

حالت اہل حرم وقت وداع علی اکبرؑ

چلے محل سے جو ہمراہ سرورِ ذیشاں
پکارتی تھیں کہ ہوتا ہے آج گھر ویراں
گلے سے لپٹی پھوپی اور کمر سے لپٹی ماں
خدا کی حفظ میں تم کو دیا علی کی اماں
بہار باغِ علی و بتول لے کے چلے
یہ پالنے کا صلہ ہے کہ داغ دے کے چلے

امام حسینؑ جوان پسر کو مرنے کی اجازت دیتے ہیں، اور کس جوش محبت سے ملاقات آخری کی رسم ادا فرماتے ہیں

جھکے نہ جاؤ ادب سے میں گر پڑوں نہ کہیں
لگا دو سینہ سے سینہ تو دل کو ہو تسکیں
خدا گواہ ہے طاقت کا مجھ میں نام نہیں
ملا دو ہونٹھ مرے منہ سے اور جبیں سے جبیں
لحاظ ہو تو کنول کب دلوں کے کھلتے ہیں
بس اس طرح سے ملو جیسے دوست ملتے ہیں

یہ کہہ کے جانبِ مقتل چلے شہِ والا
نہ باہر آپ مرے ساتھ آئیے بابا
بس آگے بڑھ کے یہ ہمشکل مصطفےٰ نے کہا
کہا امام نے مجبور ہوں میں اے بیٹا
نہ اس طرح سے کبھی مضطر و حزیں جاتا
یہ مجھ کو دل لیے جاتا ہے میں نہیں جاتا

حضرت علی اکبرؑ کی جنگ

نہیں ہے تاب یہ اعدا کو ہے گلہ دل کا
لہو اگلنے سے نکلا یہ حوصلہ دل کا
خطر کی فوج نے لوٹا ہے قافلہ دل کا
جگر کا خاتمہ ہے اور فیصلہ دل کا
عجیب عالمِ حیرت میں سب جفا جو ہیں
کہ ایک تیغ سے جو رنگ دونو پہلو ہیں

صفت تیغ سر شکن

دکھا رہی ہے چمک تیغ کی نیا انداز
نکل چلا کوئی بچ کر جو تفرقہ پرداز
دکھائی دیتی ہیں روحیں جو کرتی ہیں پرواز
لگا کے آپ نے اوچھا سا وار دی آواز
کہ زخمِ تیغ دو دم یادگار لیتا جا ✱ نشانی ایک تو اے بد شعار لیتا جا

رخصت پسر پر مادر علی اکبر کا تاسف

یہ سن کے بانوئے ناشاد بے قرار آئی
ہوا ملال کہ ہونٹوں پہ جان زار آئی
سیہ لباس پہن کر وہ سوگوار آئی
قریب زینب ناچار اشک بار آئی
پسر کو دیکھ کے خاموش بھی رہا نہ گیا
بس ایک آہ تو کی اور کچھ کہا نہ گیا

اُٹھے سلام کو یہ گر پڑیں وہ تھرا کر
اُٹھیں سنبھل کے تو چلائیں اے علی اکبر
کہاں کا قصد ہے قربان ہو گئی مادر
جگر پہ تیر چلا دل پہ چل گیا خنجر
مرے دُکھے ہوئے دل کو عبث دکھاتے ہو
مجھے بھی لیتے چلو گر جہاں سے جاتے ہو

ذرا پھوپی کی طرف میرے لال دھیان کرو
رضا کے واسطے منت نہ میری جان کرو
بس اب سوا نہ محبت کا امتحان کرو
جئیں گی بعد تمہارے نہ یہ گمان کرو
قریب مرگ ہیں کیا دیکھتے ہو حال ان کا
تمہیں قبول ہو صدقہ گئی ملال اِن کا

پدر ہیں پیر جواں تم ہو گھر کا بار اٹھاؤ
وہ راہ دیکھتی ہوگی بہن کو لینے جاؤ
سکینہ دیر سے روتی ہے پاس اپنے بلاؤ
بلائیں لینے دو اے لال مُنہ تو آگے لاؤ
غضب ہے ماں کا ضعیفی میں ساتھ چھوڑتے ہو
تھکے ہیں پاؤں ہمارے تو ہاتھ جوڑتے ہو

جناب علی اکبر کا جواب نصرت حسین

جھکا کے سر کو یہ کہنے لگے علی اکبر
پھوپی کا ۔ آپ کا ۔ ارشاد تو بجا ہے مگر
نہ کس طرح سے بجا جاؤں میں سوئے لشکر
کوئی نہیں ہے اکیلے کھڑے ہوئے ہیں پدر
غلام ساتھ نہ اس وقت دے وفا نہ کرے
جو اُن کی جان پہ کچھ آ بنے خدا نہ کرے

جناب زینب فرماتی ہیں

اگر یہ جانتی میں تم کو پالتی نہ کبھی
اگر یہی تھا تم الفت نہ مجھ سے کرتے کبھی
مگر جہاں میں بھتیجے کو چاہتے ہیں سبھی
کرو یہ وعدہ تو دیتی ہوں تم کو رخصت ابھی
کہ ساتھ ساتھ سوئے فوجِ شام جاؤں گی
تمھیں ہٹا کے میں شمشیر و تیر کھاؤں گی

مزاج میں ابھی بچپن ہے اے شبیہ رسول
مٹائے دیتے ہو کیوں دونوں ریاضِ بتول
یہ ضد نئی ہے کہ مرنے کے واسطے ہو ملول
بھلا بسی ہوئی بستی اُجاڑنے سے حصول
پھوپی کا نام ہے میرا نہ غم سوا ہوگا
بتاؤ ماں ابھی سُن پائے گی تو کیا ہوگا

یہ ضد ہے جانے والوں کے ساتھ گو باہر
بھلا میں غیر ہوں ماں باپ تو نہیں ہیں غیر
ریاضِ خُلد میں جانے کو جانتے ہو سیر
یہ جان لو کہ ہے دونوں کا خاتمہ بالخیر
خیال کچھ تمھیں بابا کی بیکسی کا نہیں
مثل ہے سچ کہ جہاں میں کوئی کسی کا نہیں

کوئی جواب دو قربان ہو گئی بیٹا
جو بستی پہلے تھی ویران ہو گئی بیٹا
میں کہتے کہتے تو ہلکان ہو گئی بیٹا
وہ صحبت اگلی پریشان ہو گئی بیٹا
ستم زدوں کو نہ تدبیر ہے نہ چارا ہے
بس اب خدا کا سہارا ہے یا تمہارا ہے

یہ کہہ کے بولیں کہ بھائی ذرا ادھر آنا
ٹھہر گیا طرفِ لشکرِ ستم جانا
یہ کچھ سمجھتے نہیں ہیں ہمارا سمجھانا
ہوا ہے بھوک میں منظور برچھیاں کھانا
جواب دیتے نہیں سر جھکائے بیٹھے ہیں * خبر بھی ہے علی اکبر وداع ہوتے ہیں

بعد حصول رخصت جنگ علی اکبر خیمہ میں تشریف لاتے ہیں اور جناب زینب محبت انگیز الفاظ میں غصہ و رنج کا اظہار فرماتی ہیں۔ زبان اور طرز گفتگو قابلِ دید ہے

محل سرا میں جو داخل ہوئے علی اکبر
پئے سلام جھکے سینہ سے لگایا سر
زمیں پہ دھوپ میں بیٹھی تھیں زینبِ مضطر
کہا میں سمجھی طلبگارِ اذن ہو دلبر

بدن سے رخصتِ جاں کا پیام لائے ہو
پھوپی کے دل کی تڑپ دیکھنے کو آئے ہو

نثار ہو گئی بے جا ہے تم کو سمجھانا
ابھی نہ ذکرِ جدائی زبان پر لانا
کہ ہو خدا کی عنایت سے عاقل و دانا
پھوپی کی قبر بنا لو تو مرنے کو جانا

ہوئی ہے بار جوانی جو مرنے جاتے ہو
ریاضتیں مری کیوں خاک میں ملاتے ہو

خدا کی شان ہوئے دل سے آپ خود مختار
لحاظ اب نہ کروں گی کہ آرہا ہے پیار
چلے ہیں مرنے کو میداں میں باندھ کر تلوار
کہوں گی لفظ خلافِ مزاج اے لدار

یقیں ہوا کہ محبت کا تم کو جوش نہیں
برا نہ مانیو واری کہ مجھ کو ہوش نہیں

جوان ہوتے ہی کیسے بدل گئے فی الفور
نگاہ اور ہے آج آنکھ اور تیور اور
کبھی تمہاری محبت کا مجھ سے تھا یہ طور
تم اور ہو گئے بیٹا۔ اگر کرو کچھ غور

یہ حال تھا کبھی دم بھر جدا نہ رہتے تھے
وہی ہو تم جو پھوپی جان مجھ کو کہتے تھے

میں کون ہوں مجھے پہچانتے ہو تم واری
ہوئے جوان ملی فوجِ شہ کی سرداری
ابھی سے بھول گئے میری محنتیں ساری
یہ سب امور تھے گویا سفر کی تیاری

شکن جبیں پہ ہے کیوں مرنے کی رضا کے لیے * خفا ہو مجھ سے کہ ماں سے کہو خدا کے لیے

اور قبیلۂ بنی ہاشم کی شجاعت کا اظہار

اُمید دل کی بر آنا ہی خون کا بہنا
ہمیشہ سینہ سپر آگے باپ کے رہنا
جو تم نے پائی ہی عزت وہ کس نے پائی ہی
یہ بات وہ ہی جو کُنبہ میں ہوتی آئی ہی

بعد شہادت جناب عباس حضرت علی اکبر رخصت میدان چاہتے ہیں اور امام حسین غم اکبر جواب دیتے ہیں۔

پھرے جو لاشۂ عباس سے امام انام
قدم پہ گر کے لگے رونے اکبر گلفام
کہا حسین نے کیوں کیا ہی پسر گل اندام
یہ جان تک ہی نثار آئے گر تمہارے کام
وطن سے دور ہوں آفت نصیب ہوں بیٹا
جہاں کا شاہ ہوں اور یوں غریب ہوں بیٹا

کہا انھوں نے کہ ہیں آپ صاحب ہمت
میں چاہتا ہوں کہ اب مجھ کو دیجیے رخصت
تڑپ رہا ہوں پئے سیر گلشن جنت
رہی نہ تاب جو دل کو تو بول اُٹھے حضرت
خیال مرگ تو اے میرے لال ہی تم کو
پدر ضعیف ہی یہ بھی خیال ہی تم کو

ہمارا حق بطرف آب ہی یا نہیں اے لال
تمام تخت جگر رن میں ہو گئے پامال
نہیں بیان کے قابل جو کچھ ہی دل کا حال
تم ایسے وقت میں رخصت کا کر رہے ہو سوال
مقام غور ہی انصاف سے گزرتے ہو
ذرا سمجھ کے کہو کیسی باتیں کرتے ہو

ہم اک بات بتائیں اگر کرو منظور
جو دل میں جنگ و جدل کا ہی شوق میرے غیور
تو ان سے لڑ کے نکل جاؤ ایک سمت کو دور
ہمیں تو کام ہی اُمت کا جان دینگے ضرور
ہمارے قتل کی احباب کو خبر دینا
پدر کی لاش کو پھر آ کے دفن کر دینا

جواں ہوئے علی اکبر جہاں سے جانے کو

بند ۱۶۰ (در حالِ علی اکبرؑ)

جناب علی اکبر کا سراپا

بلائیں لیتی ہے چہرہ کی زلفِ عنبر بو — سفیدۂ سحرِ عید ہے بیاضِ گلو
ہزار آئنے صدقہ وہ مہ لقا پہلو — بھرے ہیں زورِ علی سے بھرے بھرے بازو

حسد کا نام بھی جس میں نہیں وہ سینہ ہے
فدا ہے جس پہ دلِ شاہ دیں وہ سینہ ہے

ہیں سب کی آنکھوں کے تارے سبھوں کے جانِ جاں — حدیث سے بھی خبردار حافظِ قرآں
نمازِ شب کے بھی پابند خوب مسئلہ داں — ستارہ چاند سے ماتھے پہ سجدہ کا ہے نشاں

عیاں تمام قیافہ سے شہر رسالت کا
رگوں میں خون کی جا مادہ امامت کا

حضرت علی اکبر کی جوانی اور فنونِ جنگ کی مشق، ان کا استفسار اور اس نوجوانِ بنی ہاشم کا شجاعت آمیز جواب

طریقِ جنگ و جدل کے چچا سکھانے لگے — ہر ایک کو قدر انداز یاں دکھانے لگے
ہوا جو شوقِ دل اعدا کے زخم کھانے لگے — ریاض جتنے کیے تھے وہ سب سکھانے لگے

اُمنگ دل کی جوانی کے ساتھ بڑھنے لگی
کمان کھینچنے لگی آستین چڑھنے لگی

جو پوچھتی تھی کبھی بانوئے امامِ زماں — یہ کیا سبب ہے کہ ہوتا ہے جنگ کا ساماں
تو عرض کرتے تھے یہ دست بستہ اے اماں — تمام اہلِ جہاں ہیں عدوئے شاہِ زماں

عوض میں شاہ کے شمشیر و تیر کھائیں گے
لہو پدر کے پسینہ پہ ہم بہائیں گے

اس کی شانِ شباب

وہ کہتی تھیں کہ مرے دضع دار کیا کہنا — سپاہیوں کو جراحت ہے پھولوں کا گہنا

چمکا کے اُس کو سبطِ نبی نے دکھائی تیغ
جھپکی پلک کہ تا بہ زمیں جا کے آئی تیغ
جھجکا لعیں کہ شاہِ امم نے لگائی تیغ
یہ بھی خبر اُسے نہ ہوئی کس نے کھائی تیغ

اُس میں بھرا نہ خون ستمگار دو ہوا
کیا ہاتھ صاف تھا مع رہوار دو ہوا

وقتِ شہادت قریب ہے شاہِ دل فگار یادِ اعزّا و انصار فرماتے ہیں کیا بیکسی کا عالم تھا۔

فرمایا مجھ حزیں کی دعائیں کہاں ہیں آئیں
قلب و جگر سے نیزے نکالیں کہاں ہیں آئیں
میری خبر برائے خدا لیں کہاں ہیں آئیں
گرتا ہوں مجھ کو جلد سنبھالیں کہاں ہیں آئیں

آفت کا سامنا ہے مصیبت کا وقت ہے
ہیں کس طرف رفیق رفاقت کا وقت ہے

چلتا ہی مثلِ تیغ دو دم وقتِ دار و گیر — آتا ہی رن میں تیر سا گو آ رہے ہیں تیر
اُڑتا ہی برچھیوں نیزوں سے گو روکے ہیں شریر — سینہ سپر ہی بہرِ شہنشاہِ بے نظیر

کس نے میں سر کو دُم سے ملایا ہی جان کے
کھنچنے میں یوں ملیں گے نہ گوشے کمان کے

توصیف تیغِ آبدار

تیغِ علیؑ ہی اور کمر شاہِ خوش خصال — تو وسطِ آسماں میں نظر آتا ہی ہلال
ہی یہ شگوں کہ فوجِ ستم ہوگی پائمال — جان اب نہیں بچے گی یہ سب کو ہوا خیال

سوئے سقر ہر ایک عدو دوڑنے لگا
مضطر ہوا رگوں میں لہو دوڑنے لگا

دُنیا میں صورتِ تن و جاں ہیں نیام و تیغ — گویا ہوں۔ تو زبان و دہاں ہیں نیام و تیغ
گل اور بوئے باغِ جناں ہیں نیام و تیغ — قلب و دلائے شاہِ زماں ہیں نیام و تیغ

دشوار ایک دم ہی ٹھہرنا نیام میں
پنہاں ہی جوہروں میں کہ ماہی ہی دام میں

معرکہ حسینؑ سے فوجِ عدو کا حال تباہ

اُکھڑے پڑے ہیں جتنے نشاں تھے گڑے ہوئے — دریائے فوجِ شر میں تلاطم پڑے ہوئے
ہیں بے حواس بدر و اُحد کے لڑے ہوئے — سردار سارے کانپ رہے ہیں کھڑے ہوئے

ہیبت سے ابنِ سعد کا دل پائمال ہی
خیمہ میں ڈر سے دوڑ رہا ہی یہ حال ہی

ایک پہلوان جنگ کو تنہا آتا ہی اور حسینؑ کے ہاتھ سے مارا جاتا ہی

فوجیں جو ہٹ گئی ہیں کھڑے ہیں امامِ دیں — پر غیظ سے چڑھائے ہیں کرتہ کی آستیں
دامن سے پونچھتے ہیں رُخِ پاک و جبیں — اُس پہلواں سے ظالموں نے منتیں جو کیں

کہہ کے چلا کہ سہل سے سر کاٹ لاؤں گا
ہو مشکل کوئی پڑے گی تو میں بھاگ آؤں گا

حاضر عوض تمہارے یہ بنتِ بتول ہے
بچ جاؤ تم تو مجھ کو شہادت قبول ہے

رخصتِ پدر اور حسینؑ کی پیاری بیٹی سکینہ

اس ذکر میں سکینہ نے بڑھ کر کیا بیاں
فرمایا ہاں خدا کی قسم اے پدر کی جاں
مرنے کا قصد کر لیا کیا اے شہِ زماں
وہ کیا کرے نہ جس کا ہو ناصر نہ مہرباں

بولیں بچا کے ظلم سے اعدا کے بھیج دو
بابا ہمیں مزار پہ نانا کے بھیج دو

اہلِ حرم سے رخصت ہو کے شاہِ عالی جناب عازمِ جنگاہ ہوتے ہیں

عزمِ جنگاہ

گھوڑے کے پاس آئے شہنشاہ لاجواب
جبریل نے سوار کیا تھام کر رکاب
بیٹھے فرس پہ تن کے تو بیری ہوئی شباب
آیا دمِ زوال بلندی پہ آفتاب

دیکھا سپاہِ شر کو غضب کی نگاہ سے
صاف آئی الاماں کی صدا رزم گاہ سے

توصیفِ فرس اور براقِ مشیت خرام

رکھا جو ہاتھ باگ پہ بجلی بنا فرس
چاروں قدم براق کے رفرف کا پیش و پس
چاہا بہت ہوا نے تن اس کا ہو مس
اڑ جاتا عرش تک جو نہ کھینچے حسینؑ بس

اس گرم رو کے نقش قدم ہیں جو راہ میں
گویا چراغ جل رہے ہیں رزم گاہ میں

یہ قصد ہے دبوں گا نہ فوجِ شقی سے میں
تھم جاؤں گا اشارۂ شاخِ جری سے میں
تلوار کیوں کھینچے صف الٹ دوں ابھی سے میں
جز سبطِ مصطفےٰ نہ رکوں گا کسی سے میں

اس سربلند سے ہے زمانہ دبا ہوا
دانتوں میں غیظ سے ہے دہانہ دبا ہوا

تنہا جو قافلوں میں ہے اُس سے پوچھیے
خوں جس کا بے گناہ بہا اُس سے پوچھیے
جو سو طرح کے ظلم سہے اُس سے پوچھیے
مومن جسے کوئی نہ کہے اُس سے پوچھیے
شق ہو پہاڑ جس سے وہ ایذا گذر گئی
آقا پہ۔ سوچیے تو سہی۔ کیا گذر گئی

آئے درِ خیام پہ شاہنشہِ انام
ہر سمت حشر ہو گیا دوڑے حرم تمام
چلّا کے بیکسوں کو کیا آخری سلام
زینب نے آگے بڑھ کے کیا دُور سے کلام
خیمہ میں آکے مجلسِ ماتم کو دیکھ لو
ہم تم کو بھائی دیکھ لیں تم ہم کو دیکھ لو

اہل حرم کو حکم صبر اور سید سجاد کو تلقین اسرار الٰہی۔

مُنہ کو پسر کے کان کے نزدیک آپ لائے
کچھ اپنے دل کا حال کہا زخمِ تن دکھائے
کیں کچھ وصیتیں تو کچھ اسرارِ حق بتائے
کہہ کر اُٹھے لعینوں سے تم کو خدا بچائے
جب ہو اکیلے دل پہ بہت جبر کیجیو
خالق ہے ساتھ صابروں کے صبر کیجیو

ظلمِ اعدا دیکھ کر جنابِ زینب بھائی سے کس یاس کے الفاظ میں فرماتی ہیں

کیا کیا ہمارے بارے میں فرما گئے رسول
پوچھے کوئی کہ ظلم و ستم سے ہے کیا حصول
افسوس جلد بھول گئے ظالم و جہول
اچھا انھیں ہماری حکومت نہیں قبول
حاکم نہیں یہ فاطمہ کی بیٹیاں تو ہیں
ہم شاہزادیاں نہیں سیدانیاں تو ہیں

خیال جدائی برادر سے حضرت زینب غش آگیا

زہرا کے نورِ عین نے دامن کی دی ہوا
جلدی سے آنکھیں کھول کے بولیں بہن فدا
جھک کر بہن بہن جو کہا ہوش آگیا
تدبیر کیا کروں کہ نہ تم مجھ سے ہو جدا

سمجھے ہیں اُس کو قبۂ نورِ الٰہ سب
پہلے یہ تھا سفید مطلّا ہوا ہے اب
نقشہ ہے بحرِ قدرتِ حق کے حباب کا
اُس کو رنگا ہے کاٹ کے رنگ آفتاب کا

پردہ

پردہ چھٹا ہوا ہے نئی ہر مثال ہے
دامانِ والدین کا سب کو خیال ہے
منہ پر حزیں کے دامنِ رنج و ملال ہے
اُڑتا ہے کب۔ یہ وجد سے فرحت کا حال ہے
پردہ بندھا ہے کب نہ گئی عقل ایک کی
پیچیدہ فرد رکھی ہے اعمالِ نیک کی

روشنی

ہر شب کو روشنی کا سماں ہے کہ واہ وا
سینہ میں جس طرح ہو دلِ عارفِ خدا
قندیل میں چراغ ہیں کس درجہ خوشنما
شمعیں بھی ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہیں پئے دعا
عرصہ ہوا ہے پیاس میں شہ کو مرے ہوئے
ہیں ہر لگن میں شمع کے آنسو بھرے ہوئے

ضریحِ انور

ہے جلوہ گر ضریحِ شہنشاہِ بحر و بر
ہیں جالیاں کہ آنکھیں ہیں بھری ہیں با نظر
زائر بیان کرتے ہیں آپس میں دیکھ کر
گویا کہ دیکھتا ہے بعینہ کوئی ادھر
شبیر تیر کھا کے مرے یہ نشان ہے
جسمِ مشبکِ شہ والا کی شان ہے

مصائبِ کربلا اور ذاتِ حسینؑ

دسویں کی صبح تک تھے عزیز و اقربا
ناگاہ ایک ایک سے ملنے لگی قضا
کم سوزِ دل تھا شاہ کا دریا گرم تھا
کوئی رہا نہ پاس بجز ذاتِ کبریا
ساری بضاعتِ شہِ ابرار لٹ گئی
تھی دوپہر قریب کہ سرکار لٹ گئی

ہی ارضِ کربلائے معلی جوابِ عرش

۱۲۰ بند (در حال امام حسینؑ)

وقارِ ارضِ مقدسہ

ہی ارضِ کربلائے معلّی جوابِ عرش
ہر ذرہ اس زمین کا ہی آفتابِ عرش
پائے نہ اس کی گرد کو بھی آب و تابِ عرش
جس کا غبار اُڑ کے ہوا ہی حجابِ عرش
وہ جائے فخرِ جنتِ عنبر سرشت ہے
کیونکر کہوں بہشت کہ رشکِ بہشت ہی

صفتِ آستانۂ روضۂ مقدسہ

روشن ہی آستانۂ شبیر کس قدر
چوکھٹ کسی کو صاف جو آتی نہیں نظر
کہتے ہیں ایک نور کا خط ہے زمین پر
ہاں ہی یہ حدِ روضۂ سلطانِ بحر و بر
اعدا نہ آنے پائیں یہاں کید کے لیے
زنجیرِ در بنی فقط اس قید کے لیے

تعریف زنجیرِ بست

زنجیرِ بست دیکھ کے کرتے ہیں سب بیاں
یہ موجِ بحرِ عفو ہی لیکن نہیں دواں
یہ بھی ہی ایک معجزۂ شاہِ انس و جاں
ہوتا ہی دور سے خطِ پیچیدہ کا گماں
بولا یہ جس کو کاہکشاں کا گماں ہوا
لوحِ جبیں سے خطِ مقدر عیاں ہوا

توصیفِ حوض

تسنیم دیکھے حوض تو ہو قصدِ ترکِ لاف
کوثر سے لاکھ درجہ ہی بہتر خطا معاف
ہیں سب کنارے صورتِ آئینہ خشک و صاف
پیاسے موئے ہیں یہ پہ اُمت نہیں خلاف
ہی طور حوض میں مئے بخشش کے جام کا
دھوکا ہی پٹریوں پہ لبِ تشنہ کام کا

کلس و گنبد

جنبش نہیں کلس کو یہ ہی شاہ کا ادب
گنبد یہ ہی چمک کہ ٹھہرتی نظر ہی کب

رضائے قضائے ایزدی

محو تھے جنگ میں کفار سے سلطانِ انام
ملک الموت نے پہلو سے کیا جھک کے سلام
لائے جبریلِ امیں وصل خدا کا پیغام
نیند آنے لگی یہ قلب کو آیا آرام
نشۂ عشق بڑھا سرورِ اکرم جھومے
دل کو جوش آگیا سلطانِ دو عالم جھومے

قتل حسین پر حالت جناب زہرا

لائے تشریف میں پر جوشۂ عرش پناہ
دوڑے جبریلِ امیں کہتے ہوئے بسم اللہ
آپ کے پالنے والوں کو ہوا غم جاں کاہ
باغِ فردوس میں نکلی دل زہرا سے آہ
چشم انور سے بہاتی ہوئی خوں ناب گئیں
قصر میں احمد مختار کے بے تاب گئیں

عرض کی دوڑیے جلدی کہ قیامت آئی
کہا حیدر سے غم و رنج کی بدلی چھائی
آپ کے پیارے نواسہ نے شہادت پائی
یا علی جلد خبر لو ہے دمِ تنہائی
اُس سے للہ نہ اس وقت جدا ہو صاحب
وقت مشکل کا ہے تم عقدہ کشا ہو صاحب

بولیں شبر سے کہ بھائی کی مدد کو جاؤ
اے مری جان اگر قصد ادھر کا پاؤ
ساتھ لیے ہو ول اس وقت ذرا بہلاؤ
زخم کاری ہیں سنبھالے ہوئے یاں تک لاؤ
ہو نزدیک بہن جان جو کھونے کے لیے
کہو صدقہ گئی ماں آتی ہے رونے کے لیے

اُس کو جینے کی مجھے صبح سے باقی نہیں آس
ہو چکے اُس سے جدا قاسم و اکبر عباس
ساتھ جو لوگ تھے سب آگئے وہ میرے پاس
جب سے آیا علی اصغر مجھے دونی ہوئی یاس

عاشقِ زار بہن رنج سے مرتی ہوگی ✻ ہائے کیا جانیے کیا اُس پہ گذرتی ہوگی

جوہرِ تیغ ہیں یا سینہ کے زخم آلے ہیں ‌‌ دل ہیں یاں سوزِ غمِ شہ کے تپخالے ہیں
دوش پہ گیسوئے پُر پیچ مگر ڈالے ہیں ‌‌ ہار پھولوں کے ہیں یا موتیوں کے مالے ہیں

سارے اس سیف میں جوہر ہی سراسر نکلے
تیغ کیا نکلی فقط میان سے جوہر نکلے

دل کو مرغوب جو ہیں جوہرِ تیغ بُرّاں ‌‌ اس کی خواہش میں گرے پڑتے ہیں سب پیر و جواں
دیکھ کر اُس کو ہمیشہ رہے اعدا بے جاں ‌‌ ان دُکانوں پہ رہا خون کا سودا ارزاں

یہ وہ بازار ہے عادل نے جسے کھولا ہے
تیغ یہ وہ ہے ید اللہ نے جسے تولا ہے

ہے گراں ایسی سنبھلتی نہیں جب تک جھوکیں ‌‌ تیز دم ایسی کہ سو کوہ نہ جس کو روکیں
شیر دل ایسی بگڑ جائے جو اعدا ٹوکیں ‌‌ سربلند ایسی کہ چبھتی ہیں فلک میں نوکیں

جانِ ستاں ایسی کہ جینے کی قسم لیتی ہے
جانیں لے لیتی ہے اعدا سے تو دم لیتی ہے

جب گیا واں ہر ایک اہلِ دغل بیٹھ گیا ‌‌ یہ پڑا بوجھ کہ سب فوج کا دل بیٹھ گیا
بولی غصّے سے اجل جب کوئی یل بیٹھ گیا ‌‌ بے حیا کھانے کو تلوار کا پھل بیٹھ گیا

کیا عجب ایک جو دستِ شہِ صفدر اُٹھے
خلق باقی نہ رہے فتنۂ محشر اُٹھے

ڈرتے ہیں سب اسے کچھ ایسی ادا آتی ہے ‌‌ ہٹتی ہے پاس سے جب یہ تو قضا آتی ہے
ناز ایسے دلِ بسمل کو سکھا آتی ہے ‌‌ اور اک ہاتھ یہیں پر یہ صدا آتی ہے

بڑھ کے آب اس کی جو تا خیز ہوئی جاتی ہے ⁂ باڑھ سے بل کے ہوا تیز ہوئی جاتی ہے

امام آمادۂ جنگ ہوتے ہیں

کہہ چکے یہ تو نظر مڑ کے سوئے لشکر کی
غیظ دیکھا تو سپہ شام کی پیچھے سرکی
ہوگئی اور ہی کچھ شکل شہ صفدر کی
ہاتھوں سے جھاڑ کے مٹی لحدِ اصغر کی
دل بے تاب کے ٹھہرانے کو سینا پوچھا
زلفیں آراستہ کیں منہ کا پسینا پوچھا

توصیف [illegible]

تھی جو مہمیز جلاشل ہوا وہ سن سے
باگیں گو روکتی تھیں لپٹی ہوئی گردن سے
نہ خبر بھی ہوئی تا چرخ گیا یوں رن سے
روح مومن کی نکل جاتی ہے جیسے تن سے
تیز تگ کون ہے ہنگامِ تگ و دو ایسا
اپنے نعلوں پہ نہیں بوجھ سبک رو ایسا

سارے اس رخش میں ہیں بادِ بہاری کے اصول
پاؤں اس لطف سے رکھتا ہے کہ کھل جاتے ہیں پھول
یہ فرس وہ ہے کہ پایا ہے جسے سرعت نے قبول
آتے ہی فصل بہار اور ہی کچھ تھے معمول
دیکھنے سے قدم اس رخش کا دریا نکلا
نعل کیا اس کے بندے پاؤں سے کانٹا نکلا

توصیف ذوالفقار لطافت خیال روانی نظم

غور سے دیکھیے ہے شوقِ وغا اس کا نام
ہاتھ قبضہ پہ جو رکھا تو اگل آئی حسام
نصرتِ شاہ میں کرتی تھی اُسے عمر تمام
میان کو کاٹ کے نکلی کہا بس سے کیا کام
مرد میداں جو ہو کیا کام ہے گھر سے اُس کو
چھپ کے جو بیٹھے بہادر نہیں کہتے اُس کو

ناگن آمادہ ہوئی زہر اُگلنے کے لیے
خوں میں غرق ہوتی ہے رنگ بدلنے کے لیے
روحیں تیار ہیں جسموں سے نکلنے کے لیے
راستے صاف ہوئے جاتے ہیں چلنے کے لیے
جاتی ہے جس کی طرف دوڑ کے وہ گرتا ہے
جس طرف پھرتی ہے یہ دستِ قضا پھرتا ہے

میدانِ ظلم اور سوالِ آب

نکلے خیمہ سے عجب یاس میں سلطانِ انام — دشت میں ایک بلندی پہ کیا آکے مقام
لیکے ہاتھوں پہ بڑھا یا طرفِ لشکرِ شام — کھول کر منہ علی اصغر کا کیا شہ نے کلام

اُن سِن دیکھ لیں اور سوکھے ہوئے لب دیکھیں
تم میں جو صاحبِ اولاد ہیں وہ سب دیکھیں

شہادتِ علی اصغر و امام حسین کے الفاظ جگر خراش

رو دیئے بعض پشیماں ہوئے بعضے بے پیر — حرملہ سے پسرِ سعد نے کی یہ تقریر
رنگ اچھا نہیں کر قطع کلامِ شبیر — اُس ستمگر نے بڑا ظلم کیا مارا تیر

باغِ جنت میں دلِ فاطمہؑ بے تیر چھدا
حلق اصغر کا چھدا بازوئے شبیر چھدا

منقلب ہو گیا ہاتھوں پہ جو وہ غیرتِ ماہ — صبر نے روک لیا آگئی تھی لب تک آہ
دیکھ کر حرملہ کی سمت کہا آپ نے واہ — یہی لازم تھا یہی چاہیئے سبحان اللہ

تشنہ لب آئے تو آب اُس کو یوں ہی دیتے ہیں
پانی جو مانگے جواب اُس کو یوں ہی دیتے ہیں

کہہ کے یہ اصغرِ ناداں کو سنبھالا شہ نے — روئے لیکن نہ کیا زور سے نالا شہ نے
غیظ آیا تھا کیا رحم کہ ٹالا شہ نے — ناوک اُس ننھی سی گردن سے نکالا شہ نے

نکہتِ غنچۂ گل تھی کہ چمن سے نکلی
روح بھی تیر کے ہمراہ بدن سے نکلی

کر کے تیار لحد روئے بہت سرورِ دیں — فاتحہ پڑھ رہے تھے بادشہِ عرش نشیں
ٹیک کر تیغ کھڑے ہو گئے فوجیں جو بڑھیں — بولے تربت کی طرف دیکھ کے دل ہو غمگیں

تم گئے ہم بھی ہیں دنیا میں مسافر اصغر * مرنے جاتے ہیں خدا حافظ و ناصر اصغر

شہادت اعزہ بعد تنہائی حسینؑ

بعد انصار عزیزوں کی جو باری آئی
شاہ کو حیدر صفدر کی وغا دکھلائی
آج تک ذکر ہے یوں سب نے شہادت پائی
چھٹ گئے بھانجے فرزند بھتیجے بھائی
دو پہر کو کوئی مونس تھا نہ شیدائی تھا
بس فقط آپ تھے اور عالم تنہائی تھا

امام خیمہ میں تشریف لاتے ہیں اور عالم تنہائی میں یوں آپ جناب زینب سے ہمکلام ہوتے ہیں

روکے ارشاد کیا اے مری غمخوار بہن
مجھ سے سب چھوٹ گئے میرے مددگار بہن
کوئی دم اور ہوں میں بیکس و ناچار بہن
اب مرے حلق پہ چلنے کو ہے تلوار بہن
وقت آتا ہے وہ نزدیک کہ لٹ جاؤ گی
جلد مجھ بیکس و ناچار سے چھٹ جاؤ گی

محبت خواہر بجناب زینب کا جواب

بولیں پیارے مرے بھائی ترے صدقے جاؤں
خشک ہیں پھول سے لب پانی کہاں سے لاؤں
دل کا جو حال ہے اس وقت کسے دکھلاؤں
چل کے میں تیرے عوض برچھیاں رن میں کھاؤں
پھر وہی رونق گلزار محمد ہو جائے
مجھ کو موت آئے مگر تیری بلا رد ہو جائے

امام عالی مقام گہوارۂ علی اصغر کے قریب آتے ہیں اور پیاس سے جاں بلب دیکھ کر اس شش ماہے کو طلب آب کی غرض سے میدان میں لانے کا قصد فرماتے ہیں۔

ماں کی محبت اور فرزند شیرخوار

کہا بانو نے بہت خوب ہے شاہ دلگیر
لیکن اک عرض کروں عفو ہو میری تقصیر
رن میں ہے دھوپ کڑی اور مرا بچہ ہے صغیر
دوسرے آتے ہیں فوج ستمگار سے تیر
شہ نے فرمایا کہ خود تیر ستم کھاؤں گا
ان کو دامن میں چھپائے ہوئے لے جاؤں گا

صفحہ دھویا ہوا ہو کھینچے جو نقشہ مانی ‌‌ گل کی پتی بھی گرے تو نکل آئے پانی
سرخ پھولوں سے عیاں خون ٹپکنے کو ہی
ساغر گل سے مئے رنگ چھلکنے کو ہی

داغ الفت نہیں بلبل کے جگر پر بھی ہیں گل ‌‌ سر دیوار بھی گل باغ کے در پر بھی ہیں گل
سب زمیں پر بھی ہیں ہر ایک شجر پر بھی ہیں گل ‌‌ اب تو گل پاؤں کے نیچے نہیں سر پر بھی ہیں گل
ایسی کثرت کبھی دیکھی نہ سنی پھولوں کی
آسماں بن گیا پھولوں کا زمیں پھولوں کی

ہیں تو مند شجر باغ میں تیاری ہی ‌‌ آج کل فصل بہاری بھی مگر ساری ہی
ہر شجر آئینہ ہو یہ حکم نیا جاری ہی ‌‌ عکس سے باغ کے دیواروں کا گلکاری ہی
منہ نقابوں سے ہیں سب اہل حیا کھولے ہوئے
گل ہوا کھا رہے ہیں بند قبا کھولے ہوئے

امام حسینؑ جدائی انصار پر اظہار ملال فرماتے ہیں اور جاں نثار جواب دیتے ہیں

باجے بجتے ہیں صف آرا ہی ادھر لشکر شام ‌‌ بیٹھے ہیں کرسی زریں پہ شہ عرش مقام
ہیں طلبگار رضا گرد ہیں انصار تمام ‌‌ آپ منہ دیکھ کے ایک ایک کا کرتے ہیں کلام
اب ذرا دھیان نہیں ہی مری غمخواری کا
بھائیو تمکو تو دعوے ہی وفاداری کا

چھوڑتے ہو مجھے اس وقت میں تم لوگ کیا ‌‌ عرض کرتے ہیں شہا اے عزت ارباب وفا
ہم نمک خوار نہ ہوتے کبھی قدموں سے جدا ‌‌ آج عزت ہمیں اسی میں ہی کہ ہوں آقا پہ فدا
خلق میں لاکھ برس کا بھی جو سن آئے گا * اس سے بہتر نہ کوئی مرنے کا دن آئے گا۔

خلق میں موردِ الطافِ الٰہی ہے علی

(بند ۱۱۴) در حالِ امام حسینؑ

دہمِ ماہِ محرم کو قیامت آئی — شبِ عاشور گئی صبحِ شہادت آئی
سپہِ شام سے تیر آئے یہ نوبت آئی — پیشوائی کو قضا تا درِ دولت آئی
مستعدِ مرگ پہ ہر صفدر و غازی اٹھا
کہ مصلے سے محمد کا نمازی اٹھا

طلوعِ صبح اور بہار

آمدِ صبح تھی اللہ کی قدرت کا ظہور — محو تھے طاعتِ معبود میں سب وحش و طیور
نظر آنے لگی ہر چیز جو نزدیک تھی و دور — جیسے سیل آتی ہے اس طرح سے بڑھتا تھا نور
آشنا بحرِ سماوات کے سارے ڈوبے
موجزن نور کا دریا ہوا تارے ڈوبے

قدرتی مناظر اور لطافتِ نظم

وہ ہوا سرد وہ سامانِ سحر چار طرف — اوس کھائے ہوئے شاخوں میں ثمر چار طرف
وہ نہائے ہوئے سارے گلِ تر چار طرف — تر بہ بھیگے ہوئے شبنم سے شجر چار طرف
جس نے جس جا کا کیا قصد وہیں پر پہنچا
کثرتِ گل سے نہ اک قطرہ زمیں پر پہنچا

اب ہیں سیدھے وہ شجر غم سے جو تھے کاہیدہ — دیکھے نرگس نے عجائب وہ جو تھے نادیدہ
گل ہیں چپ چپ جیسے ہو معشوق کوئی غمدیدہ — برگِ گل سایہ میں ہیں یا لب ہیں مسی مالیدہ
دفعتاً ہو گیا ہر ایک چمن جائے بہار
پھیل کر سایہ ہوا خیمۂ لیلائے بہار

ایسی سیرابی میں ہے نہیں جس کا ثانی — اس میں پوشیدہ کسی بحر کی ہے طغیانی

انتخاب مراثی

(مطلعوں کی فہرست)

لکھنؤ کمال شناس جیسا پہلے تھا۔ ویسا ہی اب بھی ہے۔ مگر زمانہ سے مجبور ہے۔ کمالات کی عملی قدر نہیں کر سکتا۔ لیکن کمال حاصل کرنے والے افراد مستحق داد ہیں باجود اس کے کہ بے زری کا ایک بھاری پتھر اُن کی راہ روکتا ہے۔ مگر اُن کی رفتار جاری ہے۔ اور اپنی جگہ یہ سوچ کے مست ہیں۔ کہ

سخی کا اگر ہاتھ پورا نہ اُٹھا ۔۔۔ فقیروں کا یوں ہی بھلا ہو رہا ہے

اب لکھنؤ اہلِ کمال کی کان ہے۔ کانِ زر نہیں۔ جو قابلِ قدر نفوس اس وقت ہیں غنیمت ہیں +

ذیل میں رشید کے چند مرثیوں کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

نواب کے ہاتھی کی طرف ہو۔ چوب دار نے پوچھا یہ کیا کرتی ہو۔ اور کیا چاہتی ہو۔ اُس نے کہا "میں نے سُنا تھا۔ اگر بادشاہ کی نظر لوہے پر پڑ جائے۔ تو سونا ہو جائے۔ میں غریب مفلس ہوں۔ سُنا تھا کہ آج بادشاہ کی سواری نکلے گی۔ اپنے مقدر کی آزمائش کے لیے یہاں کھڑی ہو گئی۔ کہ دیکھوں میرا لوہا بھی سونا ہوجاتا ہو یا نہیں"

چوب دار نے واپس آکر یہ حکایت ہوبہو سمع ہمایوں تک پہنچائی۔ حکم ہوا۔ کہ وہ ظرفِ آہن اشرفیوں سے بھر دیا جائے۔ حکم کی دیر تھی۔ اُس بڑھیا کو خزانۂ شاہی تک ہاتھوں ہاتھ پہنچا دیا گیا۔ جہاں اُس کے ظرفِ آہن پر سنگ پارس کا عمل کیا گیا +

"اے آصف الدولہ کاش یہ لکھنؤ تمہارے بعد کسی دوسرے نام سے پکارا جاتا"

علوم وفنونِ قدیمہ کے انحطاط کو ہندوستان میں ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گذرتا ہو۔ مگر لکھنؤ اور حیدر آباد میں اُن کا تنزل سست رفتار سے جاری تھا اور ہو۔ حیدر آباد اگر اپنی حالت پر قائم بھی رہتا تو جائے تعجب نہ تھا۔ کیونکہ بفضلہٖ وہاں کے اولوالعزم نواب اپنے ملک وقوم کی بہتری کو ہمیشہ مدِ نظر رکھتے چلے آئے ہیں۔ اور علوم وفنون کے معین رہے ہیں۔ مگر لکھنؤ کے لیے یہ امر باعث فخر ہو کہ باوجود اسبابِ تنزل پیدا ہونے کے یہ سرزمین کاملین کو پیدا کرتی ہو۔ اور اسی طرح شاید پیدا کرتی رہے گی میں یہ نہیں کہتا کہ لکھنؤ میں ہوائے کمال ایک ہی طرح چلتی رہی ۔ ہاں تغیر ہوا اور ضرور ہوا۔ درختِ کمال کی شادابی کے ذرائع بالکل مفقود ہو گئے۔ اس حالت پر بھی شگوفے پھوٹے۔ مگر اس زمینِ خشک کی فطرتی تری اُن کے رنگ و بُو کو اچھی طرح ابھارنے میں ناکافی ثابت ہوئی۔ بلکہ بہت سی کمزور کونپلیں زمانہ کی گرم ہوا کی تاب نہ لاسکیں اور نکل نکل کے مرجھا گئیں۔ چارہ کیا تھا۔ یہ ہنوز ہوا دہند کی قسمت +

لکھنؤ اور اہلِ کمال دورِ آصفی

آصف الدولہ کے وقت سے لکھنؤ میں ترقیِ علوم و فنون کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اور واجد علی شاہ مرحوم کے قیام تک ختم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ قدرے کچھ زمانہ سے موجودہ وقت تک بھی اہلِ کمال افراد کے وجود کا سلسلہ جاری نظر آتا ہے۔ مگر وہ وقت ہی اور تھا۔ اور یہ وقت اور ہے۔ لکھنؤ میں اُس وقت کمال کی جو قدر تھی اُس کو زمانہ جانتا ہے۔ آصف الدولہ کی نگاہ قدرشناس نے گوارا نہ کیا۔ کہ اہلِ کمال کو اُن کی خدمتوں کا صلہ نہ ملے۔ اور اشرفیوں کے توڑوں پر مہریں لگی رہیں۔ سخاوت کا عام مینہ برسایا۔ اور یوں برسایا۔ کہ اُس کی بوچھار آوردہ کے گرد اگرد تک پہنچی۔ اور لوگ پھولے پھلے نظر آنے لگے۔

ایک عجیب سنگِ پارس

ایسے دوسرے متعدد واقعات کے ضمن میں یہ واقعہ بھی کہن سال لوگوں کی زبانوں پر درجۂ تواتر رکھتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ ہمارا والی نواب ہاتھی پر رونق افروز۔ اپنی رعایا کی مختلف حالتوں کو اُن کی صورتِ حال سے مشاہدہ کرتا ہوا جوہری بازار سے گزر رہا تھا۔ شان یہ تھی کہ آگے آگے نہ تو کڑکیتوں کی گرجتی ہوئی آواز۔ نہ صدائے دورباش نہ ماہی مراتب۔ نہ پس و پیش جلوس۔ پھر کیا تھا۔ جو وقارِ شاہی کو نمایاں کرتا۔ اور جاں نثار رعایا کو آدابِ شاہی بجالانے کی طرف متوجہ کرتا۔ نہیں! نہیں! شان و شوکت شاہی کی علامت تھی اور ضرور تھی۔ وہ یہ کہ چند سفید پوش چوبدار دست بستہ ہمراہِ رکاب مگر خاموش۔ کہ اتنے میں ہودج سے ایک نرم آواز آئی "ہاتھی روکو" فیلبان نے فوراً تعمیلِ ارشاد کی۔ پاؤں کی حرکت روک دی۔ انکس ترچھا کر دیا ہاتھی تھما۔ ارشاد ہوا "دیکھو وہ بڑھیا جو سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔ کیا چاہتی ہے" چوبدار دوڑا۔ دیکھا کہ ایک عجوزہ ایک لوہے کا ظرف لیے کھڑی ہے۔ جس کا رُخ

مرجعیت عوام بھی حاصل ہی۔ اُن کی طرزِ مرثیہ خوانی سب سے جُدا ہی اور خوب ہی +

رشید سیدھا سادا پڑھتے تھے

مرثیہ پڑھنے کے لیے وجاہت خاص اور آواز مناسب زیادہ درکار ہیں۔ رشید نہ تو ایسے قوی الجثہ تھے۔ اور نہ فطرت سے آواز بلند عطا ہوئی تھی۔ پھر مرثیہ خاطر خواہ کیونکر پڑھ سکتے۔ دوسرے یہ کہ وہ پُرانے وقتوں کے لوگوں میں سے تھے۔ منبر پر بیٹھ کر جسم کو غیر معمولی حرکت دینا ہی قبیح سمجھتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ انیس کا پڑھنا بہت تہذیب تھا۔ وہ صرف آواز کے اُتار چڑھاؤ اور اشارات سے کام لیتے تھے۔ آج کل کے پڑھنے والے تو منبر کی چولیں ہلا دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رشید بہت نرم لہجہ میں سیدھا سادا پڑھتے تھے۔ اور خود بھی کہتے تھے "میں اس سے بہتر مرثیہ نہیں پڑھ سکتا" +

واقعی مرحوم سرِ منبر اپنے کلام کی سچی داد لیا کرتے تھے۔ جس میں طرزِ ادا کا بالکل لگاؤ نہ ہوتا تھا۔ اہلِ مجلس کے اشتیاق کی یہ صورت ہوتی تھی۔ کہ ہمہ تن محوِ سماعت +

قدر شناسی

ایک مرتبہ کا ذکر ہی۔ کہ شدید گرمیوں کا زمانہ ہی۔ آفتاب نصف النہار پر ہی۔ اور رشید چوبیس رجب کو امام باڑہ اکرام اللہ خاں میں نیا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ گرمی کی یہ حالت کہ تمام اہلِ مجلس پسینہ میں عرق عرق۔ دستی پنکھے چل رہے ہیں۔ مگر پھر بھی بمصداق "بادزن دست بدست ہمہ۔ وز دم او باد بدست ہمہ" تسکین نہیں ہوتی ظاہر ہی۔ کہ ایسی حالت میں انسان کیونکر اطمینان سے سُن سکتا ہی +

رشید نے بھی رنگِ مجلس پہچان لیا۔ اور اختصار کرتے کرتے۔ ایک دفعہ مرثیہ روک کے فرمایا "پنکھے رکھ دیجیے۔ اور یہ تین چار بند سُن لیجیے" سبھوں نے فوراً پنکھے رکھ دیے۔ جس سے رشید کے کمال اور سامعین کی قدر افزائی اور کمال شناسی کا اندازہ ہوتا ہی +

ہندوستان کی آئندہ نسلوں کی زبان پر جاری رہے گا - ان بزرگواروں کا نام بھی دوسرے محسنین زبان کے ساتھ ساتھ دُنیا نہ بُھلا سکے گی۔

خاندان انیس کے نوجوان مرثیہ گو اس وقت عروج - فائق - حسن - قدیم - ہیں - جن سے آئندہ نام انیس برقرار رہنے کی اُمید کی جاتی ہے +

طرز مرثیہ خوانی

ظاہر ہے کہ شعر میں وقتی اثر پیدا کرنے کے لیے شاعر کو پڑھنے کا سلیقہ اچھا معلوم ہونا چاہیے۔ جس کے بغیر بدل یا تحمّل غیر ممکن ہے خصوصاً مرثیہ کے لیے لازمی ہے۔ اس لیے کہ واقعات کا نقشہ کھینچنے کے لیے حرکات یا طرز ادا ناگزیر ہیں۔ اور شاید مرثیہ کے علاوہ کسی اور صنفِ سخن کو طرز ادا کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور مرثیہ کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ اُس میں کا بیشتر حصہ رزم اور اُس کے لوازمات سے مملو ہوتا ہے۔ مثلاً تلوار کا بانکپن - نیزہ بازی کی ادا - تیر اندازی کی دھج - پیدل کے ٹھاٹھ - سوار کے تیور ہاتھوں کی صفائیاں - بچاؤ کی پھرتیاں - اسب برق رفتار کی چمک - نیمچوں کی لچک تلوار کا کاٹ - لڑائی کے گھمسان - ایسی چیزیں ہیں - جن کو عملی اظہار کا جامہ پہنانے کی سخت ضرورت ہے - یہ مانا کہ ان سب کا نظم کرنے والا ہر صنف کے مناسبات کو انتہائی کوشش سے صرف کر کے دکھاتا ہے۔ مگر جس وقت پڑھنے بیٹھے گا - اُس وقت اُس کو احساس ہو جائے گا کہ کہہ لینا اور شے ہے - اور ادا کرنا دوسری چیز - انیس کے متعلق پڑھا بھی ہے - اور اُن کے سُننے والوں سے سُنا بھی - کہ وہ مغفور اپنے پڑھنے کے ذریعہ سے کلام کا حُسن دوگنا نہیں بلکہ چوگنا کر دکھلاتے تھے - اُن کے بعد کے مرثیہ پڑھنے والوں میں بہت مختلف پڑھنے کے طریقے ایجاد ہوتے گئے - یہاں تک کہ اس وقت کے بہترین مرثیہ پڑھنے والے جناب سید خورشید حسن صاحب عروج ہیں - اور جن کو مجمع رائٹنگ

اُن کی بہترین تصانیف میں ہی۔ اور جس کا حصۂ مصائب ایسا ہی۔ کہ اُن کے دوسرے مرثیوں میں اُس کی نظیر کم ملے گی۔ بہرحال رشید نے بھی مصائب پر خوب خوب نظر ڈالی۔ مگر چونکہ بہت شوخ طبیعت پائی تھی۔ اس وجہ سے سادگی پسند نہ آتی تھی۔ جو بات کہتے تھے اُس میں ایک بات پیدا کر دیتے تھے۔ برخلاف اس کے مصائب کے لیے سچے واقعات اور پراثر الفاظ کے سوا جدتِ تخیل یا نازک خیالی کی چنداں ضرورت نہیں +

حاصلِ کلام یہ کہ رشید و عارف اس دورِ آخر میں انیس کا نام روشن کر گئے اور اپنے اپنے رنگ میں بادشاہی کی۔ بلکہ خدا نے انیس ہی کو عنایت فرمایا تھا۔ کہ اُن کے یہاں شوخی اور شانِ مرثیہ دونوں حصے برابر کے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ خوبی اُس شاعرِ وہبی کے خصوصیات میں سے ہی +

انیس و نفیس | انیس کے بعد نفیس مرحوم نے باپ کا نام ایسا ہی روشن کیا۔ جیسا ایک صاحبِ کمال کا قابل فرزند کر سکتا ہی۔ لیکن چونکہ نفیس مغفور کی استعداد علمی کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ فلسفہ۔ منطق۔ ادب۔ عربی و فارسی میں اچھی دستگاہ بہم پہنچ چکی تھی۔ مفتی میر عباس صاحب شوستری کے چشمہ علوم سے کافی سیراب ہو چکے تھے اس وجہ سے کلام نہایت چست اور مضبوط۔ صنائع و بدائع سے مملو۔ لطائف شعری ہر پہلو سے مکمل۔ اُس پر طرہ یہ کہ باوجود اس جید استعداد کے کلام میں ثقالت کا بالکل پتہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ایک باخبر شاعر تھے۔ اُن کی زبان بھی انیس کی زبان سے جدا نہ تھی۔ فرق اتنا تھا کہ "نفیس انیس کی اُردو اپنی زبان سے ادا کرتے تھے" +

اس تمام تمہید سے میری غرض یہ تھی کہ انیس کے بعد اُن کے نام کو برقرار رکھنے والے مونس و حید نفیس رشید عارف جلیس تھے۔ جب تک اُردو کا آخری لفظ

انیسؔ و نفیسؔ کا کمال اُن سے زندہ رہا۔ رہے رشیدؔ اُن کو نفیس سے اتنا تعلق ضرور تھا۔ کہ ماموں تھے۔ اور بس۔ نہ اُن کے کمال سے ان کے خاندان کو وجہ تفاخر ہو سکتا تھا۔ نہ اِن کے کمال سے اُن کے خاندان کو۔ اُن کا رنگ سخن الگ۔ ان کا جُدا۔ مگر زبانِ انیس ضرور مشترک تھی۔ چنانچہ بارہا رشیدؔ مرحوم نے نفیسؔ مغفور سے کہا "ماموں جان اُردو میری مادری زبان ہی" اور اُن مغفور نے جواب دیا "ہاں میاں سچ کہتے ہو"

رشید و عارف

نفیسؔ کے بعد عارفؔ مغفور نے زمانہ کو اپنا معرف بنایا۔ اور خوب خوب فرمایا اس مقام پر اتنا لکھ دینا ضروری ہی۔ کہ جہاں تک لفظ مرثیہ گوئی۔ اپنے اصلی معنوں میں مستعمل ہو سکتی ہی۔ کہا جا سکتا ہی۔ کہ عارفؔ مغفور بھی بہت کامیاب رہے۔ عارف مغفور مرثیہ رونے رُلانے کے لیے کہتے تھے۔ اس سے کسی کی تفریح خاطر مقصود نہ ہوتی تھی۔ شانِ مرثیہ قائم رکھنے میں وہ اپنے پرنانا انیسؔ کے پورے پورے پیرو تھے۔ بس یہ نہیں کہتا کہ رشیدؔ نے مرثیہ گوئی کا حق ادا نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ عارفؔ مغفور نے زبانِ انیس کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مصائب پر زیادہ نظر ڈالی۔ میں ایک حد تک ماننے کو تیار ہوں کہ رشیدؔ کے مرثیے سلاست۔ محاورہ۔ نزاکتِ خیال جدتِ تخیل کے بہترین نمونے ہیں اور یہ خوبیاں عارفؔ کے یہاں کم سہی۔ مگر مرثیہ جس کا نام ہی وہ عارفؔ کے کلام میں بہت پایا جاتا ہی۔ رشیدؔ نے بھی اکثر مرثیوں میں۔ ایسی شان مرثیہ قائم رکھی ہی کہ جس کا جواب نہیں۔ چنانچہ منجملہ اور مرثیوں کے اُن کا یہ مرثیہ جس کا مطلع ہی۔

"شاہ پر ماریہ ہیں ابر الم چھانے لگے"

نقش ثانی بسبقت لے گیا ہو۔ ملاحظہ کیجیے۔ آزاد سے پہلے تذکرہ نویسوں نے شعرا کے
تذکرے لکھے اور مقبول بھی ہوئے۔ مگر آج ہم تذکرۂ آبِ حیات کو جن خوبیوں سے
مملو پاتے ہیں پیشتر کے تذکرے اُس سے معرّا ہیں +

رشید کی فکر سلیم

مگر رشید کی فکر سلیم بہار اور ساقی نامہ کے ایسے صحیح انداز وپر پہنچ گئی تھی۔ کہ
اُس کے آگے خاتمہ نظر آتا ہی، اُن کے دورانِ حیات ہی میں مرثیہ گویوں نے بہار
اور ساقی نامہ میں اُن کا اتباع کرنا شروع کر دیا۔ اور بڑی بڑی کوششیں کیں۔ مگر رشید
کی بہار اور ہی رنگ دکھاتی ہو۔ اور اُن کے ساقی نامہ کی کچھ اور ہی شان نظر آتی ہو۔
آیندہ صدیوں میں بھی کہنے والے بہار اور ساقی نامے کہیں گے۔ مگر اُس وقت کی
موجودہ نقادنظروں کا یہ بڑا کام ہوگا۔ کہ رشید میں اور اُن میں فرقِ امتیاز نکال لیں۔

رشید کی شہرت کا دوسرا سبب

جنابِ رشید کی مرجعیت عامہ کا یہ دوسرا سبب تھا۔ جو اوپر بیان ہوا۔
انھوں نے موجودہ نسل کے کانوں کو بہار اور ساقی نامہ کا اس قدر عادی بنا دیا ہی۔
کہ اب یہ کیفیت ہی۔ ادھر مرثیہ خواں کو منبر پہ صرف تھوڑا سا عرصہ گذرا کہ سامعین میں
بے چینی کے ساتھ بہار یا ساقی نامہ کے مضامین کا انتظار ہونے لگا۔ بلکہ گویا جس مرثیہ
میں ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز نہیں وہ مرثیہ نامکمل کہلاتا ہی +

یہ سب کچھ تھا۔ مگر نفیس زندہ تھے۔ رشید ایک ممتاز مرثیہ گو تھے۔ اور مرجع
عوام بھی۔ لیکن بعد وفاتِ نفیس رشید اور ہی رشید ہو گئے تھے۔ اگرچہ اس جاں گزا
حادثہ نے بظاہر خاندانِ انیس میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ کیونکہ نفیس کے بعد
اُن کے نواسہ میر علی محمد صاحب عارف مغفور مرثیہ کہتے تھے۔ مگر اُس وقت ابتدا
تھی۔ لہذا نظر پر نہیں پڑتی تھیں۔ لیکن بعد کو جنابِ عارف بھی مشہور ہوئے اور

ہی بہت ضعف اسی نشہ کے سہارے پہنچوں
آنکھ ہو بند تو کوثر کے کنارے پہنچوں

یا (مدحِ عباس کے لشکر کا علم دار ہوں میں) اس مرثیہ میں اوپر کے بندوں میں سفرِ شہیدِ کربلا سے تمام عالم کے متاثر ہونے کا ذکر کرتے کرتے۔ ذکرِ گل و بلبل اس مقطع سے چھیڑ دیتے ہیں (کچھ تو ہو روح کو فرحت کہ عجب عالم ہی) اور مضامین بہار سے سامعین کے دلوں میں ایک تازہ لہر پیدا ہو جاتی ہی۔

اور ہی رنگ ہوا آگئی گلشن میں بہار
زلفِ سنبل کی ہوئی مشک فشاں عنبر بار
یوں ہوا دوڑ ہی کہ تھرائے چمن کے اشجار
کر دیا سبزۂ خوابیدہ کو جلدی بیدار

دل پہ قابو نہیں بیتاب نظر آتی ہیں
بلبلیں شاخوں پہ جا جا کے اُتر آئی ہیں

جس طرف دیکھو زمانہ کی بہار آئے نظر
یاسمن وہاں ہی تو عالم ہی یہاں سوسن پر
درمیاں میں ہی جو سورج مکھی اُس کی ہی خبر
دو پہر بیچ میں ہی صبح ادھر شام اُدھر

صنعتِ صانعِ قدرت کو کوئی کیا بدلے
یہ نہ بدلیں گے اگر لاکھ زمانہ بدلے

رشید کو رشید کی حیثیت سے دیکھیے۔ اور داد دیجیے۔ وہ ساقی نامہ اور بہار کے موجد تھے۔ اور کسی شی کا موجد اُس کو اپنی زندگی میں اتنا درجۂ کمال تک نہیں پہنچا سکتا۔ کہ اُس کی تکمیل آئندہ کامل کُن دماغوں کے احسان سے بے نیاز رہے یعنی آنے والے اہلِ نظر اُس کے کمزور پہلوؤں کو درست نہ کریں +

تاریخِ ادب میں ہمارے سامنے ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جن میں نقشِ اول

تو زیادہ اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ انیس ونفیس کے یہاں بہار اور ساقی نامے پائے جاتے ہیں۔ مگر مختصر اور شاذ۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ رشید کی پختہ کاری بھی ترقی کرتی گئی۔ کم از کم ہندوستان کے تمام شیعی حلقوں میں مشہور ہو گئے۔ اور جا بجا سے طلب ہوتے رہے +

سچ تو یوں ہے کہ رشید مرثیہ میں بہار اور ساقی نامہ کے موجد تھے۔ اور ان مضامین کو مرثیہ کے ہر حصہ میں کھپا دینے کی اس قدر حیرت انگیز قوت پائی تھی۔ کہ جہاں چاہتے تھے بے تکلف ساقی کو پکار لیتے تھے۔ جس موقع پر چاہتے تھے چمن آرائی کرنے لگتے تھے۔ اور کچھ ایسے اسلوب سے کہ سننے والے یکایک متحیر ہو کے بلند آواز میں داد دینے لگتے تھے +

قابل غور یہ امر ہے کہ ذیل کے بندوں کے پہلے جناب عباس کے نہر پر تشریف لانے کا ذکر کرتے چلے آتے ہیں۔ اور سامع کو یہ گمان بھی نہیں گذرتا کہ عنقریب ساقی نامہ شروع ہونے والا ہے۔ کہ یکایک رشید یہ مصرعہ پڑھتے ہیں ع نہر پر جائیں گے ہم تھوڑا سا پانی لینگے + اور ساقی نامہ کی یوں ابتدا ہو جاتی ہے۔ کہ

ساقیا نہر پہ سقائے حرم جاتا ہے   کچھ برا رنگ زمانہ کا نظر آتا ہے
ہو گئی فکر سوا نشہ جو کم پاتا ہے   جلد دے جام پیکش ترا چلاتا ہے

نشہ ہو صاف تو اعدا کی صفائی لکھوں
خوب لڑ جائے طبیعت تو لڑائی لکھوں

ناتواں پیر ہوں تن گھل گیا غم سے کل کے   ساقیا پھول ہوئی جام ہوں ہلکے ہلکے
پینا منظور ہے منہ تیرے قدم سے مل کے   ہو یہ ساماں تو مری عمر کا ساغر چھلکے

ساقی نامے کہے اور یوں کہے۔

ساقی نامہ

ہم ازل سے مئے اُلفت کا پیا کرتے تھے جام — عہدِ طفلی میں بھی رہتا تھا اسی کام سے کام
اُسی صورت سے ہوئی ختم جوانی کی شام — صبح پیری کی ہے صبوحی کا ہے ساقی ہنگام

نزع میں تیری محبت کا بھریں یا دم ساقی
غیر کچھ کھا کے مرے پی کے مریں ہم ساقی

مئے اُلفت تری دل میں ہے کہ شیشہ میں پری — اس کی مدحت سے تو اسلام کی کھیتی ہے ہری
رہتی ہے جس کی ثنا سے لبِ کوثر پہ تری — کبھی ہوتی نہیں مستوں کو تری بے خبری

ایسے مے خوار ہیں دن رات پیا کرتے ہیں
ہم تو سوتے میں ترا نام لیا کرتے ہیں

دھو دیا ابر نے رحمت کے مرا دامن تر — نہیں تیری مئے اُلفت سے کوئی شئے بہتر
میں تو ہرگز نہ پیوں گو کہ ملیں سو ساغر — میرے نزدیک تو ہے ہیچ شرابِ کوثر

نہرِ فردوس ہے کیا مے کا خزینہ ساقی
تیرے ماتھے کی شکن میں ہے پسینہ ساقی

ساقیا حد کا گنہگار تھا یہ عبدِ ذلیل — سچ کہوں خلد میں جانے کی نہ تھی کوئی سبیل
مئے اُلفت تری پائی گئی بخشش کی دلیل — آئے تھے غصہ میں بالیں پہ مرے عزرائیل

پینے والا ہے مرے ساتھ کا یہ جان گئے
منہ مرا دیکھتے ہی ہنس دیئے پہچان گئے

اگرچہ رشید کے قبل کے مرثیہ گویوں نے اس شعبہ کو بالکل نظر انداز نہیں کیا تھا

بہار و ساقی نامہ

رشید کی زبان تو جیسی تھی ویسی تھی۔ اُنھوں نے طرزِ مرثیہ میں طباعی سے کام لیا۔ اور واقعی اس کی ضرورت بھی تھی۔ وہ جدت یہ تھی۔ کہ اُنھوں نے مرثیہ کے مقررہ مضامین میں سے ایک گوشہ نکالا۔ اور وہاں غزل کے چلبلے مضامین۔ اس خوبصورتی سے صرف کیے۔ کہ مرثیہ کا ایک نیا جزو ہو گئے۔ وہ کیا۔ وہ ساقی نامہ اور بہار۔ رشید کے ہر مرثیہ میں ساغر و گل کے اذکار وہ بہار دکھانے لگے۔ کہ شیدائے مضامینِ غزل مست ہو ہو کر داد دینے پر مجبور ہوئے۔ اب کیا تھا۔ اب رشید کو بہارِ کلام کا رستہ مل گیا۔ سامعین کو مستِ خیال کر دینے کی راہیں معلوم ہو گئیں۔ بہار کہی اور یوں کہی۔

بہار

گل و بلبل میں جو باتیں ہیں ذرا گرما گرم — آنکھ نرگس کی جھکی جاتی ہے اللہ ری شرم
اس قدر فصلِ بہاری نے کیا ہے آزرم — خواب مخمل کی طرح ہو گئے ہیں کانٹے نرم

پھل ملا بلبلِ نالاں کو شکیبائی کا
پھول ہے داغِ جگر لالۂ صحرائی کا

ایک قسم مخمل نرم

جب سنی پائے نسیمِ سحری کی آہٹ — اُٹھنے کو سبزۂ خوابیدہ نے بدلی کروٹ
ہر طرف کھلنے لگے باغ میں غنچے چٹ پٹ — اُٹھ گئے سارے عروسانِ چمن کے گھونگٹ

دل کھلے فصلِ گذشتہ کا تاسف نہ رہا
اب ذرا بھی گل و بلبل میں تکلف نہ رہا

چربہ اُتارتا ہی۔ فلاں کی عبارت میں رنگینیٔ مضمر رہی +

اگر ان لوگوں کو زمانہ نے اظہارِ کمالات کا موقعہ نہ دیا ہوتا۔ تو آج کتابِ ادب میں سادے ورق نظر آتے اور وہ بھی بے رونق +

لکھنؤ میں جہاں انیسؔ اور دبیرؔ تھے وہاں ایک تیسرا اگرچہ مختصر گروہ عشقؔ کے ماننے والوں کا بھی ضرور تھا۔ اور یہ حضرات بھی دوسروں کی طرح اپنے پسندِ خاطر ذاکر کے خاندان سے محبت رکھتے تھے +

چنانچہ ایک شخص مرزا عبد العلی نامی اشرف آباد میں رہتے تھے۔ اور عشقؔ مغفور کے فدائیوں میں تھے۔ اُن کی مجالس میں۔ سوائے خاندانِ عشقؔ کے دوسرا ذاکر زیبِ ممبر نہ ہوتا تھا۔ عشقؔ مرحوم نے بڑے بڑے معرکہ آرا مرثیے اُن کی مجالس میں پڑھے۔ اُن کے بعد تعشقؔ مرحوم کے لیے وہی ممبر زینۂ شہرت بنا۔ اور اب آخر میں رشیدؔ کی باری آئی۔ اور اُن کا فرض ہوا۔ کہ اُس آبائی ممبر کے وقار کو اپنے بزرگوں کی طرح برقرار رکھیں۔ چنانچہ بعد وفات تعشقؔ مرحوم۔ رشیدؔ نے ابتدائی نہیں بلکہ آزمائشی مجلسیں اشرف آباد میں پڑھیں +

ان مجالس کے جھول کا اندازہ۔ اس سے ہو سکتا ہی۔ کہ انیسؔ، دبیرؔ، مونسؔ عشقؔ، تعشقؔ، وحیدؔ۔ دُنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ نفیسؔ کا آخری زمانہ تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ کہ کوئی نئی آواز ممبر سے بلند ہو۔ اور گذشتہ اہل کمال کے انتقال کے بعد اُن کے اشتیاقِ سماعت کو مطمئن کرے۔ کہ یکایک رشیدؔ کی اُبھرتی ہوئی طبیعت نے اُن کی مخلصانہ دلچسپیوں کے برقرار رکھنے کا وعدہ کیا۔ اور آخر عمر تک اُس کی پابندی کی +

رباعی

لاکھوں گلِ مضموں ہیں چمن میں میرے	ہی عشق کا رنگ ہر سخن میں میرے
گویا ہی زبان اُن کی دہن میں میرے	مشتاق کلام انیس کا مجھ سے سُنیں

عروج

رسمِ زمانہ ہی۔ کہ جب تک اہلِ کمال کی ترقی کے اسباب فراہم نہیں ہوتے اُس وقت تک اُس کا جوہر نہیں کھُلتا۔ مگر جس وقت ایک حد تک زمانہ رُوشناس ہو جاتا ہی۔ تو پھر اُس کو مزید مدد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ دوسرے اُس سے مستفیض ہونے لگتے ہیں۔ اور یہ قانون فطرت ہی۔ کہ ہر شئ کو ابتداءً مدد کی ضرورت ہوتی ہی۔ اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہی۔ کہ پھر احتیاجِ مدد نہیں رہتی۔ مثلاً ایک پوَدا جس کی کونپلیں پھوٹ رہی ہوں باغبان کی دستِ تربیت کا محتاج ہوتا ہی۔ مگر جب اُس کو پوری نشو و نما ہو جاتی ہی۔ تو وہی باغبان ثمرِ محنت پاتا ہی۔ اور جھولیاں کی جھولیاں بھر لیتا ہی۔ یہی حال عوام کا ہی۔ کہ ایک زمانہ تک درختِ کمال کو پرورش کرتے ہیں۔ پھر اُس کے سایہ میں بیٹھ کر فرحتِ رُوحانی حاصل کرتے ہیں۔ یعنی جہاں وہ گمنامی کے تاریک پردہ سے نکلا۔ اُس کے فیوضات عوام میں پھیلنے لگے۔ اور اُس کا نہ مٹنے والا نام دُنیا کی لوحِ دل پر محفوظ ہونے لگا +

فیوضاتِ کمال

آج ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیائے نظم و نثر میں جو اہلِ کمال کوس لمن الملکی بجا چکے ہیں۔ اُن کے بعد کی آنے والی نسلوں نے۔ اُن کے کمال سے کیسے کیسے درس لیے ہیں۔ میدانِ سخن میں دیکھیے تو کہا جاتا ہی۔ کہ فلاں شخص میر کا رنگ کہتا ہی۔ فلاں غالب کی ترکیبوں کا دلدادہ ہی۔ فلاں داغ کا اتباع کرتا ہی۔ فلاں طرزِ مرثیہ میں انیس کا پیرو ہی۔ فلاں دبیر کا +

نثر کو لیجیے تو کہتے ہیں۔ فلاں شخص آزاد کی سی عبارت لکھتا ہی۔ فلاں شبلی کا

اختیار کرنا بھی تو بے سود۔ وہی مرثیہ۔ وہی چہرہ۔ وہی سحر۔ وہی خاندانِ رسالت۔ وہی واقعاتِ کربلا۔ وہی لڑائی۔ وہی نتیجہ۔ اور ان سب کا ایک بہتر کہنے والا انیس موجود۔ پھر رشید کو دفعتاً اتنی قبولیت کہاں سے ہو جاتی +

لیکن رشید بھی سمجھتے تھے۔ کہ اگر نیا مرثیہ لکھنؤ میں پڑھا جائے۔ تو ایسا تو ہو جس کو لوگ اچھا نہ کہیں تو بُرا بھی نہ کہیں۔ لہذا جو مرثیہ کہا اُس میں اپنی انتہائی قوت صرف کی۔ اور ایسے مصرعہ نکالے کہ زبان زد عوام ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ جہاں مرثیہ گوئی کا ذکر ہوتا۔ تو نفیس کے ساتھ ساتھ رشید کا نام بھی ضرور لیا جاتا +

بہ حیثیت مرثیہ گو رشید کی شہرت کا پہلا سبب

اس قدر جلد رشید کی مرثیہ گوئی میں شہرت کا باعث۔ مؤلف کی رائے میں دوسرے اسباب کے ساتھ اُن کا ایک مشہور غزل گو ہونا بھی تھا۔ جب تک نفیس زندہ رہے رشید بیشتر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ اگر نفیس کا نام مرثیہ گویوں کی فہرست میں اوّل تھا۔ تو رشید کا نام بھی غزل گوئی میں فرد لیکن چونکہ رشید نے اپنی قوتِ غزل گوئی سے مضامین مرثیہ گوئی میں کام لینا شروع کر دیا تھا۔ لہذا اُن کی برق مثال طبیعت نے بھی اپنا کام کیا۔ اور جدتِ خیال اور چستیِ زبان کے ایسے ایسے انمول نمونے پیش کیے۔ جنہوں نے رشید کو رشید بنا دیا اور سامعین کے دلوں میں قدر کرا دی +

اب رشید میدانِ مرثیہ گوئی کی پہلی منزل طے کر کے۔ شہرت کے اُس نمایاں مقام پر پہنچے۔ جہاں سے یہ صدائیں آنے لگیں ”رشید نے کیا زبان اور کیا طبیعت پائی ہے“ عوام کی اس قدر افزائی نے رشید کا دل ہاتھوں بڑھا دیا۔ اور متواتر مشقِ سخن نے اُن کو زبانِ انیس کا مستحق وارث منوا دیا۔ چنانچہ اس رباعی میں خود بھی تفاخرانہ فرماتے ہیں

رشید اور مرثیہ

رشید نے میدانِ مرثیہ گوئی میں جلد سے جلد اس وجہ سے قدم رکھا۔ کہ اول تو یہ ننہال کی میراث تھی۔ ثانیاً یہ کہ کوئی دوسرا ذریعہ ایسا نہ تھا۔ جو آئندہ اُن کی اور اُن کے متعلقین کی معاش کا سبب ہوتا۔ سوچے کہ عشق و تعشق کے دورانِ حیات میں حصولِ کمال کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ چنانچہ مختصر مختصر متعدد نئے مرثیے تصنیف کیے۔ اور عشق مغفور کو دکھائے۔ جو موضوعاتِ شاعری کے اُس وقت بہتر سے بہتر جاننے والے تھے۔ دوسرے تعشق مرحوم کے خداداد رنگِ کلام نے رشید پر کچھ ایسا اثر کیا۔ کہ بغیر اصلاح لیے اُن کے کلام میں تعشق کی نازک خیالیوں کی بو آنے لگی۔ ماسوا اس کے خود بھی طباع تھے۔ اس وجہ سے جدتِ طبع کے میدان میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔ مگر یہ زمانہ گویا صرف مشق ہی مشق کا تھا۔ گو کبھی کبھی عشق یا تعشق کی پیش خوانی بھی کر دیتے تھے۔ اور لکھنؤ والوں کے سامنے اپنی آئندہ بہار کے نمونے پیش کر دیتے تھے +

نفیس و رشید

اب وہ وقت آیا۔ کہ عشق کا انتقال ہوا۔ تعشق نے وفات پائی۔ جدھر دیکھتے ہیں کوئی کفیل نظر نہیں آتا۔ چاروناچار طبیعت پر زور ڈالا۔ اور چست مرثیے کہہ کے پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر اُدھر شہرتِ انیس اپنی پوری آواز سے گونج رہا تھا۔ یعنی نفیس کے کلام کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ عوام میدانِ سخن میں جس قدر کی نظر سے نفیس کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسرے کا حصہ ہو سکتا۔ ساتھ ساتھ مشکل یہ تھی۔ کہ جو راہیں مرثیہ گوئی میں۔ انیس کا قلم پیدا کر گیا تھا۔ اُس کی پابندی بھی ناگزیر تھی۔ کیونکہ انیس کی آواز کا اثر ابھی محو نہ ہوا تھا۔ اس لیے کوئی دوسرا رنگ مطبوعِ عوام نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی متنفس انیس کے رنگ سے علاوہ کسی دوسرے رنگ کو

نظر یوں اُن کی میری سمت کو پھر پھر کے آتی ہی / کہ جیسے ہر طرف گرتا ہوا سرشار جاتا ہی

آج پھر کل کی طرح ہجر کی رات آتی ہی / دیکھیے کیا ہو وہی دل ہی وہی پہلو ہی

اس بیخودیٔ عشق کا عالم ہی جدا ہی / جب غور سے دیکھو نہ فلک ہی نہ زمیں ہی
احباب کو ہی فکر سحر ہو تو وہ آئیں / یاں صبح کے ہونے ہی کی اُمید نہیں ہی

واہم گیسو سے جو چھوڑا تو گزر جائیں گے / عاشقِ زلف اسی رات کو مر جائیں گے
وہ نہلاتے ہیں تو کہتے ہیں بگڑ کر گیسو / چھوڑ دیے چھوڑ دیے ہم آپ سنور جائیں گے

ہم گئے دُنیا سے لاکھوں دل کے ارماں رہ گئے / تھے جو تم کو یاد وہ بھی عہد و پیماں رہ گئے
کون اپنے خون کا قاتل سے دعویٰ کر سکا / ہاتھ اُٹھ کر سیکڑوں سوئے گریباں رہ گئے
ناتوانی یہ بتا دے کس سے جا ہوں گا مدد / گر اُلجھ کر ہاتھ میں تارِ گریباں رہ گئے
قتل گہ میں پاؤں سے تا دیر ٹھکرایا گیا / ایک سر پہ سیکڑوں قاتل کے احساں رہ گئے

کانپ اُٹھتا ہوں جو محفل میں چھلک جاتا ہی جام / میں تو واقف ہوں کہ بیتابی کی لذت دل میں ہی

تیرہ بختی سے ہی شکوہ مفلسی سے ہی گلہ
اپنی وحشت سے ہی شکوہ دوسرے سے کیا گلہ

روشنی ممکن نہیں شامِ غریباں کیا کرے
ہم سے جب بیٹھا نہ جائے کوئے جاناں کیا کرے

تیزی پہ اپنی تیغ کی پھر کیجیے گا ناز
اُڑ کر پڑی ہی خاکِ شہیدانِ ناز کی

پہلے گلے تو کاٹ کے دو چار دیکھیے
دامن کی سمت بھی دمِ رفتار دیکھیے

یاس و حسرت سے یہ بلبل کے گراں باری ہوئی
لاکھ من کا ہی قفس اک مشتِ پر کے بوجھ سے

نہ زخمِ تن کھلا کوئی نہ ٹپکے خون کے قطرے
رشید احباب نے کیا بے کسے رختِ سفر باندھا

نہ کوئی ہنسنے والا ہی نہ کوئی رونے والا ہی
خبر اتنی تو کرتے قافلہ اک جانے والا ہی

کب ترے دامِ محبت سے رہا ہوتا ہی
کوئی سو مرتبہ مر جائے تو کیا ہوتا ہی

داغِ دل غیر نہ دیکھے تو دکھاؤں تم کو
شمعیں لایا ہوں چھپا کر تری محفل کے لیے

آرزومندِ شہادت کی وصیت سب سے ہی
نام لکھوا جائے میرا جب کوئی خنجر بنے

تماشا شام سے کچھ حال کا اپنے نہ غم ایسا
اے جوشِ جنوں کیوں یہ ہنسی ہوتی ہے ہم

تا صبح میں رو دیا کیا غفلت پہ کسی کی
ہم تو کبھی ہنستے نہ تھے وحشت پہ کسی کی

کیسا کوچہ ترا دنیا سے اُٹھا جاتا ہوں
آج کچھ ایسی طبیعت مری گھبرائی ہے

میرے دردِ عشق سے ایذا ہی ساری خلق کو
موت بہتر ہے جو اتنا طول بیماری کرے
عشق گلیوں میں پھرے لیکن نہو پردہ دری
حُسن پردہ میں رہے اور گرم بازاری کرے

مجنوں نے راہِ عشق میں چومے مرے قدم
اُلفت میں اتنی بات تو پیدا کرے کوئی

جو ہوا ہے صورتِ بادِ مخالف تیز ہے
دل کا میداں ہے کہ اک صحرائے آفت خیز ہے
دل کے ٹکڑے کر دیے باتیں سُنا کر بزم میں
کس قدر تیغ زبان یار مجھ پر تیز ہے
ہے رشیدؔ اب تک گیاہ لکھنؤ مردم گیاہ
کیا زمیں ہے جو اجڑ جانے پہ مردم خیز ہے

بھر چکے پامالِ گورِ غریباں کر چکے
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے آپ احساں کر چکے

خاک حسرت لے گئے دل لئے ویراں لے گئے
آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گئے

قفس میں دام میں پرواز کرنے کا یہ باعث تھا
ہوا پرواز کرنے کی ہر اک پر سے نکل جائے

جوشِ وحشت میرے تلووں کو ایذا ہی سہی
ہیں جہاں ہو آبلے دس خارِ صحرا بھی سہی
دل میں وقتِ نزع حسرت ہے کہ دیکھیں آپ کو
مرتے مرتے خیر جینے کی تمنا بھی سہی

ہیں پریشاں جمع کر کے آپ کے ارمان ہم
اپنے دل کو جانتے ہیں حشر کا میدان ہم

ٹکڑے شکستہ حال دلِ ناتواں کے ہیں
اتنا نہ پوچھیے یہ مسافر کہاں کے ہیں

کیا جوڑتے ہیں آپ دلِ پارہ پارہ کو
معلوم بھی ہے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں

دندانے جا بجا تری شمشیر میں نہیں
شکوے زبانِ تیغ پہ مجھ ناتواں کے ہیں

اے شبِ غم صبح ہو جائے گی یا آئے گی موت
فیصلہ دم بھر میں ہے یا تو نہیں یا ہم نہیں

غمزۂ حسن کا یہ تفرقہ ہے
چمن میں گل ہے بلبل آشیاں میں

مجھ کو منظور ہے مرنے پہ شب باری ہو
اور احباب کو ہے فکر کفن بھاری ہو

آتشِ حسن جوانانِ چمن بھڑکا دیں
جو گلِ سرخ کی پتی ہو وہ چنگاری ہو

کیا سبب ہے کیوں تڑپتی ہیں قفس میں بلبلیں
دیکھ اے صیاد گلشن کی ہوا آئی نہ ہو

میری چشمِ شوق کو کیا ہو گیا ہے اے رشید
اس سے لڑنا کیا کبھی جو آنکھ شرمائی نہ ہو

جی بھر کے دیکھ سکتے نہیں گل کو عندلیب
کھٹکا لگا ہوا ہے کہیں باغباں نہ ہو

آج یوں خاک نشینِ درِ قاتل اٹھے
سیکڑوں لاشیں اٹھیں سیکڑوں بسمل اٹھے

ساقیا شیشۂ مے توڑا جو بے دردی سے
مست محفل سے تری تھامے ہوئے دل اٹھے

مری آنکھوں کو ہی خوں بار رہنا — ذرا اے ابرِ تر ہشیار رہنا
پس مردن نہ رکھے گی صبا خاک — ترے کوچہ میں ہی بیکار رہنا

محفل میں جو روز آتے ہیں اُن لوگوں سے پوچھو — کب متصل در مرا بستر نہیں ملتا

زبانِ تیغ سے کب گفتگو میں رہ جاتا — میں کوئی خون کا قطرہ نہ تھا کہ بہ جاتا

زاہد سا شخص بن گیا ہی میکدہ میں دُزد — چُپکے سے ہاتھ جانبِ پیمانہ لے گیا

غش میں بھی تھا یاری کا انتظام — چونک اُٹھا میں جب ذرا کھٹکا ہوا
اے رشید اشکوں کا یہ طولِ عمل — دامنِ محشر بھی ہی بھیگا ہوا

بعد مرنے کے نہ اُتریں پاؤں سے گر بیڑیاں — خیر ہم سے اور جنوں سے سلسلہ رہ جائے گا

بے ترے حکم نہیں یاں سے ہیں جانے والا — غیر ہی کون مجھے یاں سے اُٹھانے والا

سینہ پہ جب کبھی کوئی آنسو ٹپک گیا — اس درجہ ناتواں ہوں کلیجہ دھڑک گیا

جنوں ہی وجہ بقا ہم شکستہ حالوں کا — کہ آبِ خضر ہی پانی ہمارے چھالوں کا

بحثِ دل کا تذکرہ کرتے بھرے آتے ہیں اشک
ساتھ یادِ کارواں سالار ہر منزل میں ہر

کچھ ایسے کام تھے باقی کہ ساتھ جا نہ سکے
معاف کیجیو اہلِ عدم ہم آ نہ سکے
بس ایسے حال میں عاشق کو آپ ڈھونڈیں
حواس جا نہ سکیں اور ہوش آ نہ سکے

ترا وحشی فقط ہے منتظر اک خندۂ گل کا
نظر سوئے چمن ہے ہاتھ رکھے ہے گریباں پر
زلیخا حال کی اپنے خبر دیتی تھی یوسف کو
کہ جب کی آہ گھر میں۔ برق چمکی آکے زنداں پر

گو آپ کو خدا نے جانِ جہاں بنایا
لیکن غضب تو یہ ہے نامہرباں بنایا
کہتا ہے ہاتھ اٹھا کر سوئے شجر یہ گلچیں
کیوں بدنصیب تو نے پھر آشیاں بنایا

جلوہ گر بام پہ جب مہرِ رُخِ یار نہ تھا
کوئی کوچے میں بجز سایۂ دیوار نہ تھا
تیری چٹکی میں دبانے کی ادا آفت تھی
کس کا دل تھا کہ قریبِ لبِ سوفار نہ تھا

سامنے لاؤں جگر دل کو نشانہ کے لیے
میں اشارہ ترا اے ناوکِ مژگاں سمجھا

تیز کرتا ہے چھری قصد اور ہے صیاد کا
اے اسیرانِ قفس وقت آگیا فریاد کا

ہم صفیروں کی طرح سے چھوٹ کر کیا جاؤں باغ
میں ساہوں پروانہ چراغِ خانۂ صیاد کا

امتحان حسرتِ پرواز کا منظور جو تھا
ذبح کر کے مجھے صیاد نے پر کھول دیے

جو نہ صبر اور دم بھر ترے بیقرار کرتے
ابھی برق کا طریقہ فلک اختیار کرتے

غم دور دو رنج سہہ کر تجھے دیتے ہم دل اپنا
انھیں بے وفائیوں پر ترا اعتبار کرتے

وہ نہ آئے مر گئے ہم اگر آتے بھی تو کیا تھا
یہی جان صدقہ کرتے یہی دل نثار کرتے

جو خلاف امید کے ہو تو شکستہ خاطری ہی
کئی ٹکڑے دل کے ہوتے جو تم ایک وار کرتے

خبر اس کی پہلے ہوتی کہ نہ آئے گا یہ ہم کو
تو رشید شعر کا فن نہ ہم اختیار کرتے

تفرقہ ڈال دیا آکے ترے تیروں نے
ٹکڑے بھی اس دل صد چاک کے باہم نہ رہے

شمع محفل ہو گئی کیوں پاس رہیں پروانے
عشق بے کار ہے جب حسن کا عالم نہ رہے

خلق میں سیکڑوں طوفان اٹھا کرتے ہیں
ہو جو منظورِ نظر چشم مری تر نہ رہے

لطفِ نظارہ پہ موقوف ہے اپنی ہستی
منہ ادھر آپ نے پھیرا کہ ادھر ہم نہ رہے

گر بھلا چاہے تو خط یار بہ مائل نہو
وہ پہلے پھولے جو اس سبزہ سے بیگانہ رہے

ہم کو بعدِ دفن بھی ایسا تصور چاہیے
رات بھر بالیں پہ شمع روئے جانانہ رہے

کوہ و دشت ہیں سر کے ٹکرانے سے صحرا تنگ ہے
کیا قیامت ہو اگر بستی میں دیوانہ رہے

ہلتے ہیں بازو ہوس اڑنے کی اٹکی دل میں ہے
حسرت پرواز پوشیدہ پرِ بسمل میں ہے

ذرہ ذرہ میں نہیں کہتے ہیں ہمارے لختِ دل
حلقہ حلقہ آہ۔ زنجیرِ درِ قاتل میں ہے

نہیں ہی دمیان تم کو جانِ جاں ہم لوگ مرتے ہیں
ہمیں خود آتی ہی ہچکی جو تم کو یاد کرتے ہیں

عجب بے رحم ہیں طفلِ حسین گلزارِ ہستی میں
گلوں کو توڑتے ہیں بلبلوں کے پر کترتے ہیں

خبر کب شانہ و آئینہ کی تھی عہدِ طفلی میں
جوانی آگئی ہی جب سے وہ بہر دن سنورتے ہیں

ذرا ہٹ جائیں سب منظور ہی اس وقت تنہائی
مری تربت میں وہ شانہ ہلانے کو اُترتے ہیں

جام چلنے کو ہی سب اہلِ نظر بیٹھے ہیں
آنکھ ساقی نہ چُرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں

تیرے بے تاب کبھی آہ جو کر بیٹھے ہیں
زلزلہ آگیا ہی سیکڑوں گھر بیٹھے ہیں

ظلمِ صیاد نے پرواز سے مایوس کیا
فکر میں سامنے رکھے ہوئے پر بیٹھے ہیں

صاف باطن ہوں نظر آرہے ہیں مجھ کو صاف
گو میں بیٹھا ہوں ادھر اور وہ اُدھر بیٹھے ہیں

دل جلے قبروں سے نکلے بھی تو کیا حاصل ہوا
بس یہی نہ گرمیِ روزِ قیامت بڑھ گئی

ایک مدت کا ہی قصہ کسی جانب دل تھا
اب نہیں یاد یہ پہلو ہی کہ وہ پہلو ہی

سلسلہ جنبانِ وحشت ہیں نئی تدبیر سے
طوق منت کے بدلتے ہیں مری زنجیر سے

دل کے ٹکڑے جوڑیے یا ساتھ لیتے جائیے
میری خاطر جمع ہو جائے کسی تدبیر سے

فتح میں بھی کی گئیں ہم پر ہزاروں سختیاں
سیکڑوں طوفاں اٹھے آبِ دمِ شمشیر سے

اے نظر انصاف سے دیکھو ذرا سوئے شہید
عاشقانہ اب غزل کیا ہو سکے مجبیر سے

نہ رہا اب تو کوئی وقت خزاں سے خالی / جو ہوا ہی چمنِ دہر میں وہ صرصر ہی
دل ہی ڈوبے بھی ڈبوئے بھی بچائے بھی رشید / یہی کشتی - یہی دریا ہی - یہی لنگر ہی

ہر اک تربت کے گُل چومیں نشانِ پائے جاناں کو / چلے دو گام جنت کر دیا گورِ غریباں کو
خدا وحشت میں برکت دے سلامت رکھے ایماں کو / کہ بسم اللہ کر کے چاک کرتا ہوں گریباں کو
تمہارے دم سے ہی اے جان ہمارا شہر میں آنا / نہیں منظور گر تم کو نہ چھوڑیں گے بیاباں کو
مجھے جوشِ جنوں ہی لیکن اتنی ہوشیاری ہی / لپیٹے ہاتھ دامن میں بچاتا ہوں گریباں کو
گھرا ہی میکدہ پر ابر شرما کر نہ برسے گا / ذرا دم بھر نہ روئے منع کر دو اپنے گریاں کو
جو ممکن ہو تو کچھ سامانِ راحت جمع ہو جائے / پریشانی ستایا کرتی ہی تیرے پریشاں کو
نظر بازی کی کیفیت ترے قیدی کو حاصل ہی / اب آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں روزنِ دیوارِ زنداں کو
رشید اُن کو پکارا قبر سے اغیار کہتے ہیں / بتائیں کس نے باتیں ساکنِ شہرِ خموشاں کو

سیئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے / تار دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے
دل ہوئے ہیں ہوسِ بوسہ میں زلفوں کے اسیر / اب تو آپہنچے ہیں نزدیک ترے شانوں کے
دل جگر پڑھتے ہیں کلمہ ترا ملکِ تن میں / ساری بستی میں یہ دو گھر ہیں مسلمانوں کے
وحشیوں کا ترے اتنا تو پتہ پایا ہی / استخواں ملتے ہیں گوشوں میں بیابانوں کے
کیا ترے نام میں تاثیر ہی سبحان اللہ / ایک دل ہو گئے تسبیح کے سو دانوں کے
شاعروں کے لیے تو ہیں گے باعث ہو رشید / تم نہ جایا کرو مجمع میں سخن دانوں کے

نظر میں خانۂ صیاد بھی ہی گلشن بھی — کہ ہم کو یاد قفس بھی ہی اور نشیمن بھی
چمن میں تھیں مجھے ساری اذیتیں راحت — بہشت تھا مرا اُجڑا ہوا نشیمن بھی
بنا تھا کیا مرا سیلاب اشک ریگ رواں — کہ جس سے تر نہوا ایک تارِ دامن بھی

لگا کے کان سُنے کون التجا میری — درِ قبول کے قابل نہیں دعا میری
صدا یہ آتی ہی جنبش سے تیرے دامن کی — نسیم مصر ہی گلزار میں صبا میری
یہ خوف ہی کہ میں کچھ عرض کر نہیں سکتا — مرے لبوں سے لپٹ جاتی ہی صدا میری
جفائیں سہہ کے جو در سے ترے نہیں ہٹتا — گلے سے مجھ کو لگا لیتی ہی وفا میری
وہی حیات کا باعث ہی جس پہ مرتا ہوں — وہی مرض ہی مرا اور وہی دوا میری

کون کہتا ہی کہ اور اب ہمیں دل چاہیے — گر عنایت ہو تو غم سہنے کے قابل چاہیے
حسرت و درد و الم اندوہ و غم پیدا کیے — دیکھیے انصاف سے مجھ کو بڑا دل چاہیے
دونوں ہیں معشوق پر مٹنے کو اتنا فرق ہی — آپ کو دل چاہیے لیلیٰ کو محمل چاہیے
ہاتھ پہلو پر دھرا ہی کرتے ہیں دلبر کی فکر — پوچھتے پھرتے ہیں گلیوں میں کسے دل چاہیے
ہر نفس جس کو زیادہ ہو تمنا قتل کی — اے مری جاں اُس کو ہر دم ایک قاتل چاہیے

طعن ساقی کی یہ ہی ہاتھ میں گو ساغر ہی — استخارہ کوئی کرنے تو بہت بہتر ہی
شوق مضمون مرا دوں سے کہ بڑھا دیتا ہی — ایک کلمہ کو اگر دیکھیے اک دفتر ہی
گو خزاں آگئی باقی ہی ابھی شان بہار — گل کی پتی ہی کہ بلبل کا شکستہ پر ہی
سوئے جب گورِ غریباں میں تکلف نہ رہا — دیکھیے پاؤں کسی کا ہی کسی کا سر ہی

لاکھوں مشتاقوں کی مٹی میں ملی ہیں آنکھیں
تیرے کوچہ میں پتہ دیتے ہیں ذرات مجھے
طالبِ دید سے یوں بے خبری کرتے ہیں
آپ سویا کیے آنکھوں میں کٹی رات مجھے
ہجر میں ابرِ سیہ آئے گا دُکھ دینے کو
اب کے رونے ہی میں کٹ جائے گی برسات مجھے
لے نہ جاؤں کہیں حاجت یہ دعا مانگ رشید
اتنی توفیق دے لے قاضی حاجات مجھے

آپ کو شک ہے کہاں ٹوٹے تھے تارے رات کو
دم بدم آنسو ٹپکتے تھے ہمارے رات کو
اُن کی آرائش بھی ہوتی ہے موافق وقت کے
دن کو مُنہ دھویا گیا گیسو سنوارے رات کو
ٹوٹے تارے سیکڑوں یوں قدسیوں کے دل ہلے
دَرد سے جس وقت ہم تم کو پکارے رات کو
چونک اُٹھتے سب مری آواز جاتی دُور تک
خوف تھا۔ دل میں چپک اُٹھی نہ یارے رات کو
ہجر کی مدت نہ ہوگی ختم ثابت ہو گیا
دن کو ذرّے گن چکا ہیں اور تارے رات کو
آگئی صبح قیامت اور میں سویا نہیں
پھر نہ آئی نیند جب سے تم سدھارے رات کو
دل جگر سینے پھر آئے صبح کو گنتے ہوئے
رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دل کو صبح سے ہر سو رشید
دلربا تھا ایک پہلو میں ہمارے رات کو

گرم رفتار ہے تیری یہ پتا دیتے ہیں
دم بدم لو مرے نقشِ کفِ پا دیتے ہیں
دل کی تم بات سمجھتے ہو زباں گو نہ ہلے
خوب سُنتے ہو جو چپکے سے صدا دیتے ہیں
صاف کرتے ہیں ابھی غیر پہ وہ تیغِ ادا
دوست آ کر مجھے پیغامِ قضا دیتے ہیں

جاگو اے مملکتِ عشق کے سونے والو
شب کو دربانِ درِ یار صدا دیتے ہیں

تیرے سودائیوں نے رحلت کی ۔ ہوئی سونی گلی محبت کی
اب بھی ہی اضطراب دل باقی ۔ لو ہی جنبش میں شمع تربت کی
کس قدر ملتے ہیں یہ دونو وقت ۔ حشر کی صبح شام فرقت کی
آپ اک بے وفا سے جا کے ملے ۔ حضرت دل یہ کیا قیامت کی
کیوں جھکاتے ہو ناز سے گردن ۔ یہی تصویر ہی ندامت کی
لاکھ بل کھائے وقت نزع شہید ۔ تیغ نے داد دی نزاکت کی

پائے قاتل پہ تڑپنا ہوگا ۔ زخم ہم کھاتے ہیں قوت کے لیے

قید ہستی سے چھٹے سارے اسیران قفس ۔ ہم بھی دو چار گھڑی اور ہیں مہمان قفس
ہاتھ کھینچے ہوئے بیٹھے ہیں اسیران قفس ۔ کہ نہ دامان قفس ہی نہ گریبان قفس
دونوں عالم جسے کہتے ہیں وہ یہ عالم ہیں ۔ صبح مرغان چمن شام اسیران قفس
تیلیاں توڑ کے بیکار کیے جاتے ہیں ۔ تا نہ ہو بعد ہمارے کوئی خواہان قفس
آشیاں بھی جو بنایا تو بعنوان قفس

آج معلوم ہوئے دل کے خیالات مجھے ۔ تم سے حال اپنا کہا کرنے نہ دی بات مجھے
شیشۂ مے کی طرح ہچکیاں آئیں اس وقت ۔ یاد کرتے ہیں کہیں اہل خرابات مجھے
یاد آیا ہم کہ تھا دل کے تڑپنے میں مزا ۔ لطف دیتے تھے ستم آپ کے دن رات مجھے
قبر میں سب سے زیادہ ہی یہ اے جان تکلیف ۔ تم سے جاتی رہی امید ملاقات مجھے

اسیرانِ چمن آزاد ہو ہو کر نکلتے ہیں
کہ زنداں سے جنازے اُٹھتے ہیں بستر نکلتے ہیں

کروں کیونکر نہ تعظیم اُس کی جولانِ خیاباں
کہ اکثر ایسے ہی لوگوں میں پیغمبر نکلتے ہیں

ہوا ہی سخت مشکل دفن ہونا تیرے وحشی کا
جہاں پر قبر کھودی جاتی ہی پتھر نکلتے ہیں

قضا آتی ہی جس دم چیونٹیوں کے پر نکلتے ہیں

بہار آئی مبارک عاشق و معشوق کو ملنا
کہ کلیاں پھوٹتی ہیں بلبلوں کے پر نکلتے ہیں

نظر کے خوف سے کتری گئی ہیں اُن کی وہ پلکیں
مری رگ رگ سے یاں ٹوٹے ہوئے نشتر نکلتے ہیں

کل جو میرے قتل پر آیا تھا خنجر باندھ کے
لے چلا ہی آج دامن میں مرا سر باندھ کے

اے مرے ہر وقت کے ایذا رساں
رہتی دُنیا تک تمہارا دم رہے

لائے ہمراہ چھری دوسری قاتل میرا
خونِ اغیار میں ہو جائے نہ شامل میرا

ایسے مضطر چلے اُس کوچہ کی جانب دونو
گر پڑا ہیں کبھی رستہ میں کبھی دل میرا

آہ مجنوں جو بڑھی غیظ سے لیلےٰ نے کہا
بس بس اب اُڑنے لگا پردۂ محمل میرا

یار کے بے مہر اُنھیں بے سر و ساماں نکلا
کوچۂ زلف سے دل ہو کے پریشاں نکلا

مثلِ بُو اپنے وطن سے میں پریشاں نکلا
جامۂ تن کو وہیں چھوڑ کے عُریاں نکلا

کہتے ہیں شبنم و گل عالمِ نیرنگ کا حال
کوئی ہنستا ہوا نکلا کوئی گریاں نکلا

جامہ زیبوں کی ہی زینت سبب جامہ دری
گھر سے نکلا جو کوئی چاک گریباں نکلا

لازم ہی مداوا غم و اندوہ و تعب کا
سُنیے تو کچھ احوال کبھی ہجر کی شب کا

جو ہیں گے قدم آپ جو پامال کریں گے
چھوٹے گا نہ ہم سے جو طریقہ ہی ادب کا

اے حضرتِ دل آنے لگی یاد جو آئی
ہر بار نہ افسانہ بیاں کیجیے جب کا

سر خم ہی مگر آنکھ مرے دل کی طرف ہی
سیکھا ہی یہ انداز نیا حسنِ طلب کا

ہوئی ہر شے میں شریک۔ ایسی ہی تاثیر بہار
در کی زنجیر کا اب نام ہی زنجیر بہار

حسن پورا ہی جواں صورت جاناں ہی بہار
انتہا ہو گئی خود اپنے پہ نازاں ہی بہار

بہار یہ مشاعرہ کے قبل لوگوں کا خیال تھا اور اُس کے بعد بھی قائم رہا۔ کہ ردیف اور قافیہ کی اضافت کو سنبھالنا بہت مشکل ہی۔ لیکن رشید کی مشاقی اور خداداد طبیعت نے قافیہ و ردیف میں ایسا ربط پیدا کر دکھایا۔ کہ سبحان اللہ یہی وجہ تھی کہ تمام لکھنؤ کے شعرا ہم آواز ہو کے کہتے تھے " ہم کو سوائے رشید کے مرثیہ کے دوسرے میں مزا نہیں آتا" ذیل میں انتخاب غزلیات پیش کش ناظرین ہی۔ رشید کے پورے مجموعۂ غزلیات کا طبع ہونا غیر ممکن ہی۔ ہاں اگر کسی وقت اُردو کی قسمت نے یاوری کی۔ تو اُس کے چھپنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔

انتخاب غزلیات

مار ڈالے گی ہمیں یہ خوش بیانی آپ کی
موت کا پیغام آئے گا زبانی آپ کی

زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہی
مہربانی آپ کی نا مہربانی آپ کی

بعد مردن کھینچ لایا جذب دل سینہ پہ ہاتھ
ایک انگوٹھی میں جو پہنے تھا نشانی آپ کی

رنگ عالم کا بدلنا آپ کے صدقہ میں ہی
جمع کر رکھی ہیں پوشاکیں پرانی آپ کی

نمو کی فصل جوانی کی آمد آمد ہی
کہ جا بجا سے مسکنے لگی قبا اُن کی

شروع اہل محبت کے امتحان ہوئے
یہ اُن کو ناز ہوا ہی کہ ہم جوان ہوئے

سُرخ آنکھیں ہیں ابھی اُٹھے ہیں خواب ناز سے
ہاتھ ماتھے پہ ... لیٹے ہیں عجب انداز سے

شروع ہوگیا۔ حتےٰ کہ متعدد نئے مرثیے ختم ہو چکے۔ اور ہر مرثیہ کے متعلق رائے عامہ قائم ہو چکی۔ اب چوبیس رجب کی صبح نمودار ہوئی۔ عاشقِ آلِ اطہار رکن العزامیر نواب علی صاحب (جن کا مشہور تعزیہ ۱۴ ربیع الاول کو اُٹھتا ہی) کی مجلس کے سامان حسینہٗ اکرام اللہ خاں میں نظر آنے لگے۔ جوق جوق لوگ آ کر جمع ہونے لگے۔ اور ذاکرِ خاندانِ رسالت جناب رشید کا انتظار ہونے لگا اتنے میں پالکی نمودار ہوئی۔ رشید آئے۔ اور تھوڑا سا آرام لینے کے بعد زیب ممبر ہوئے۔ مرثیہ شروع ہوا۔ ساقی نامہ ختم ہوا۔ سامعین نشۂ مضامین میں سرشار۔ ساقی کوثر کو یاد کر کے ذاکر کو مست آواز میں داد دے رہے تھے۔ کہ یکایک رشید نے مرثیہ کا ورق اُلٹا۔ بہار آگئی۔ گل و بلبل کے نازک تعلقات کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی۔ مضامین تازہ کا رنگ مجلس پر چھا گیا۔ کہ ایک مرتبہ رشید نے بلند مگر نرم آواز میں جناب عزیز۔ جناب محشر کو یوں مخاطب کیا۔ بھئی عزیز سنو! بھئی محشر سنو! لوگ سمجھے کہ کوئی خاص مضمون ہی۔ جس پر ان حضرات کی توجہ چاہتے ہیں۔ مگر رشید نے جو بند شروع کیا۔ تو معیار کے گذشتہ بہاریہ مشاعرہ کی طرح میں۔ پھر کیا تھا۔ یہ دو نو بند رشید کی قوتِ غزل گوئی کا ثبوت دینے لگے۔ فرماتے ہیں۔

فصل بدلی کہ ہوا تیر ہوا تیرِ بہار	ہیں دلِ اہلِ حسد زخمیِ شمشیرِ بہار
اب تو ہر قسم میں نظر آتی ہو تصویرِ بہار	گل رگوں سے ہوا ہی رشتۂ زنجیرِ بہار

کبھی آہستہ کبھی تیز ہوا چلتی ہی
اسی موسم میں جنوں خیز ہوا چلتی ہی

خود بہار آئی ہی کیا چیز ہی تصویرِ بہار	قطرے شبنم کے بنے بہرِ خزاں تیرِ بہار

جاوید۔ فصاحت۔ انجم وغیرہم۔ ہر شاعر سند طلب کو بغیر اُس کی قابلیت کا صحیح اندازہ کیے ہوئے ایسی سند نہ دے دیا کریں جس کا وہ مستحق نہو۔ کیونکہ ایسے اسناد سے عوام میں زبان کے متعلق غلط فہمی کا اندیشہ ہی۔ مباداایسے سند یافتہ شعرا کی خودساز بندشیں یا محاورات جو ادب اُردو کی حدود میں نہوں۔ دوسرے غیر مطلع صحاب میں رواج پا جائیں اور عام ادب پر غیر صحیح اثر پڑے"۔

گو آبر مرحوم کا یہ خیال درست تھا۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ مرحوم سے تھوڑی سی غلطی ہوئی۔ اگر اُس مضمون کا رخ فرداً فرداً اساتذہ لکھنؤ کی طرف نہوتا بلکہ عام ہوتا۔ تو غالباً کسی کو شکایت نہوتی اور معیار بھی اپنی پوری رفتار سے جاری رہتا۔

اب میں اس مبحث کو ترک کر کے مطلب پر آتا ہوں۔ یعنی ماہانہ مشاعروں کے علاوہ معیار کا ایک سالانہ بہاریہ مشاعرہ ایک وسیع پیمانہ پر ہوا کرتا تھا۔ اور مصرعہ طرح کی ردیف لفظ "بہار" ہوتی تھی۔ موسم بہار ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۱۲ع میں بہاریہ مشاعرہ جناب شہنشاہ حسین صاحب وکیل کے باغ میں ہوا جو گومتی پار واقع ہی۔ مصرعہ طرح یہ تھا۔

لوحِ معیار نظر آتی ہی تصویرِ بہار

اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں۔ مشاعرہ کامیاب رہا۔ مشاعرہ کے قبل ہی تمام شہر میں اس مصرعہ کے چرچے تھے۔ اور واقعی طرح بھی نئی تھی۔ قریب قریب لکھنؤ میں غزل کہنے والے تھے۔ سب نے اس طرح پر طبع آزمائی کی عام اس سے کہ شریک مشاعرہ ہوئے یا نہیں

معیار کا بہاریہ مشاعرہ اور رشید

رشید مغفور سے لوگوں نے غزل بھیجنے کی خواہش کی مگر اُنھوں نے غزل نہیں کہی۔ مشاعرہ کے بعد کئی مہینے گذر گئے۔ یکایک رجب کا چاند نکلا۔ لکھنو کے مرثیہ گویوں میں غیر معمولی سرگرمی پیدا ہوگئی۔ سامعین نے آخری تاریخوں کا شدید انتظار

محشر - دیارِ عشق تک لازم ہی مرکے بےخطر جانا ⁘ کہ بند آنکھیں کیے ایک ایک منزل سے گذر جانا

اس صورت میں پڑھنے والا اچھی طرح تصفیہ کر سکتا تھا۔ کہ کس شاعر نے کونسا قافیہ اچھا کہا ہی + اوّل اوّل یہ رسالہ ہندوستان بھر میں شعرا کا منظور نظر رہا۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ جتنی آپس کی شکر رنجیاں بڑھتی گئیں۔ اُسی قدر اُس کی قبولیت میں کمی آتی گئی + علی محسن خاں صاحب آبر مرحوم مدیر معیار گو شعر وسخن کے سچّے دالداہ تھے۔ اور اُس کی خدمت کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے۔ لیکن معیار ایسے پرچہ کا وقار قائم رکھنا اُن کی استعداد سے باہر تھا۔ جب تک قلمی امداد فراہم کرتے رہے۔ اُس وقت تک اُس کی قبولیت میں ضعف پیدا نہوا۔ مگر جب سے معاونین کا قلم رُکا۔ اُس وقت سے معیار میں ایسا ضعف پیدا ہوا کہ پھر نہ سنبھلا۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ حامد مغفور کی زندگی ہی میں بند ہو گیا۔ اور پھر متعدد کوششیں اُس کے جاری کرنے میں ناکامیاب ہیں +

معیار کیوں بند ہوا؟

میری رائے میں معیار کے بند ہونے کی زبردست وجہ یہ تھی کہ آبر مرحوم نے ایک مضمون کے لکھنے میں خود رائی سے کام لیا۔ جس کا ناگوار نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بہت سے وہ وقیع ممبر جو معیار کے سچّے معین تھے کنارہ کش ہو گئے۔ اور پھر شریک نہ ہوئے۔ اگرچہ اُن لوگوں نے جنابِ حامد مغفور کے اخلاق حسنہ اور وجاہت ذاتی کے اثر سے کُھلم کُھلا مخالفت نہ کی۔ مگر دلوں میں غبار باقی رہا۔

اُس مضمون کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ اساتذۂ وقت یعنی رشید۔ عارف۔ افوج۔

مرحوم نے ''معیار'' ایک ادبی رسالہ کی بنا ڈالی۔ جس کی عجب انوکھی طرز تھی حصۂ نثر کے معاونین جو قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تھے۔ مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی۔ مولوی سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی۔ مولوی سید احمد صاحب ناطق لکھنوی منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا۔

معاونین حصۂ نظم کے لکھنؤ کے خوش گو شعرا

مثلاً۔ جناب صفی۔ جناب ثاقب۔ جناب عزیز۔ جناب محشر۔ جناب احسن۔ جناب آرزو جناب بلیغ۔ جناب ثروت۔ جناب بہار۔ جناب شرر۔ جناب فاضل۔ وصف۔ شفیق وغیرہم اس کے خاص ممبر تھے۔ ہر ممبر کے مکان پر باری باری ماہوار مشاعرہ ہوتا تھا۔ پہلے منتخب قوافی طبع آزمائی کے لیے دیدیے جاتے تھے۔ اور پھر ہر قافیہ کے تحت میں ہر ایک کا شعر تقابل کی صورت میں معیار میں چھاپا جاتا تھا۔ چند شعر یہاں نمونۃً تحریر ہیں

مشاعرہ جناب محشر منعقدہ ۲۷ نومبر ۱۹۰۹ء

احسن۔ بس وصل اُن سے چھٹ جانا کہ بعد وصل مرجانا + بہر صورت دو روزہ زندگی کے دن گذر جانا

آرزو۔ اُدھر سے گہ ادھر جانا ادھر سے گہ اُدھر جانا + یونہی اکثر ترے کوچہ میں ہم کو دن گذر جانا

بلیغ۔ دل بیتاب میں اک ہوک سی اُٹھتی ہے مرجانا + تعجب خیز ہے اپنا زمانہ سے گذر جانا

ثروت۔ نہیں ممکن ترے ناوک کو بھی دل چھوڑ کر جانا + کہ ہے دشوار صحرائے محبت سے گذر جانا

حامد۔ یہی میرے لیے گویا کہ جیتے جی ہے مرجانا + تمہارا دیر کرنا وقت وعدہ کا گذر جانا

دانش۔ ہزاروں کو یونہی دیکھا ادھر آنا اُدھر جانا + مگر پھر بھی نہ اس دنیا کو ہم نے رہ گذر جانا

صفی۔ جب ایسی زندگانی ہو تو پھر بہتر ہے مرجانا + کسی تکلیف کا حدِ تحمل سے گذر جانا

عزیز۔ یہاں تک متصل رونا کہ آخر کار مرجانا + قیامت ہے قیامت سر سے پانی کا گذر جانا

ومثنوی وقطعہ ومخمس ورباعی۔ ہمہ را خوب مے گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست
بسیار خوش گو است۔ ہر شعرش طرفے لطف رستہ رستہ۔ در چمن بندیِ
الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرعۂ برجستہ اش را سروِ آزاد بندہ
پیشِ فکرِ عالیش فکرِ عالی شرمندہ۔ شاعرِ ریختہ۔ چنانچہ ملک الشعرائیِ ریختہ
اورا شاید۔ قصیدۂ در ہجو ہست گفتہ بہ تضحیک روزگار۔ دور از حدِ مقدور داد
صفتہا بکار بردہ۔ از اتفاق طرح غزل باہم می اُفتد۔ از مغتنماتِ روزگار است
حق تعالےٰ سلامتش دارد" (از تذکرہ میر صفحہ ۳۲)

رشید و شعرائے لکھنؤ

تمام شعرائے لکھنؤ رشید کو سند مانتے تھے۔ اور اُن کے تصفیہ کو نظرِ قبول سے دیکھتے تھے۔ اگر کوئی رسالہ شعر و سخن کا جاری ہوتا تھا۔ تو رشید کے کلام کو باعث وقعت سمجھ کر ایک ممتاز جگہ چھاپتے تھے۔

لفظ "آبدست" مؤنث ہی

چنانچہ جب لفظ "آبدست" کے متعلق تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہوا تو حکیم جلال مرحوم۔ اور دیگر نامی شعرا نے لکھا۔ کہ آبدست مذکر ہی۔ اس وجہ سے کہ "آب" اور "دست" دونو مذکر ہین لہذا دونوں کی ترکیبی صورت بھی مذکر ہونی چاہیے۔

جس وقت جنابِ رشید سے اس لفظ کے متعلق استفسار کیا گیا تو اُنھوں نے فرمایا" میں۔ اور میرا خاندان اس لفظ کو مؤنث بولتا ہی"۔ اور مزید شہادت یہ دی کہ انیس مغفور بھی اس لفظ کو مؤنث بولتے تھے۔ رشید اس دورِ آخر میں ایسے خوش نصیب شاعر تھے جن کو اُن کے معاصرین نے بھی مانا۔ یہ بات اس عہدِ حریت میں نعمت سے کم نہیں ہی۔

رسالہ معیار کی ابتدا

نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مغفور نے جو ادب اُردو کی خدمت کی ہی اُس کی داد کون دے سکتا ہی۔ ع "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

مجھے اس وقت جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مرحوم کا شعر یاد آگیا۔ جو اُنھوں نے گویا ایسے ہی مواقع کے لیے تصنیف کیا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

یہ منزلت بھی غنیمت ہی اہلِ دُنیا کی ۔۔۔ ملا کے خاک میں ذکرِ کمال ہوتا ہی

ایک دوسرے موقعہ پر فقیر مؤلف اور چند دوسرے حضرات خدمتِ رشید میں حاضر تھے کہ ایک شاگرد نے ایک نظم اصلاح کے لیے پیش کی۔ جو کسی جلسہ میں پڑھنے کے لیے کہی تھی۔ رشید نے اول سے آخر تک نظم کو دیکھا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کے فرمایا ”اس شہر قومی نظم کا کہنے والا اس وقت صفیؔ سے بہتر لکھنؤ میں نہیں“۔

تفاخرِ شاعرانہ دوسری چیز ہی۔ رشید میں خودنمائی اور خودستائی بالکل نہ تھی۔ اُن کی نظروں میں ہر صاحبِ کمال کے کمال کا صحیح اندازہ تھا۔ اور اُسی کی مناسبت سے عظمت بھی۔ اہلِ فہم کے نزدیک انصاف پسندی بجائے خود ایک کمال ہی۔

بہترین مثال فدائے سخن میر تقی کا انصاف

میر تقی میرؔ نے اپنے معاصرین کا ایک مختصر تذکرہ فارسی میں لکھا ہی جو ابھی انجمن ترقی حیدرآباد کی طرف سے چھپا ہی۔ اُس میں قابلِ لحاظ یہ امر ہی۔ کہ میر صاحب نے ہر شاعر کے کلام پر انصافانہ نظر ڈالی ہی۔ اور میرے خیال میں دادِ تذکرہ نویسی دی ہی۔ لیکن قابلِ صد تعریف یہ امر ہی۔ کہ وہی سوداؔ جو اُن کا مردِ میدان اور فنِ شاعری کا حریف تھا۔ اُس کی نسبت میرؔ کے قلم نے ذرا لغزش نہیں کی۔ اور جس انصاف کا وہ مستحق تھا۔ اُس سے کچھ زیادہ اُس کی مدح سرائی کی ہی۔ ذیل کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

مرزا رفیع المتخلص بہ سوداؔ۔ کہ جوانے خوش خُلق و خوش خُوئے۔ گرم جوش یار باش۔ بشگفتہ روئے۔ مولدِ او شاہ جہان آباد است۔ نوکری پیشہ۔ غزل و قصیدہ

غور کیا جائے۔

یہ جلسہ بالکل مغربی تہذیب کے موافق تھا۔ شعرائے لکھنؤ میں حضرات جاوید حمید حامد۔ عزیز۔ آبر۔ وغیرہم شریک تھے +

رشید صدر جلسہ مقرر ہوئے

جلسہ شروع ہوا۔ اور چند موقر حضرات کی تحریک و تائید سے حضرت رشید رئیسِ مجلس منتخب ہوئے۔ رشید کرسیِ صدارت پر بیٹھے۔ غالباً اُن گوشہ گیر وعافیت پسند مرحوم کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ جنابِ حامد مغفور اور دیگر حضرات نے تحفظِ زبان، کے متعلق تقریریں کیں۔ اور بالاتفاق یہ طے پایا۔ کہ ایک "لغت خاص" لکھنؤ کے اربابِ فن اور اہلِ زبان مرتب کریں۔ بانیِ جلسہ نے اپنی عالی ہمتی سے اس کام کے لیے۔ ایک رقم کثیر دینے کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ مگر انجام کیا ہوا؟ یہ نہ پوچھیے۔

حضرتِ رشید نے اُس جلسہ میں کچھ باتیں درمیان میں۔ اور کچھ ختم صحبت پر فرمائی تھیں۔ جو نہایت دلچسپ اور کارآمد تھیں۔ ایک محل پر اصنافِ سخن کے متعلق فرمایا تھا۔ "غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ ان سب کی زبانیں الگ الگ ہیں"۔ جس کی شرح اہلِ زبان۔ اور ماہرین فن بہت کچھ کر سکتے ہیں +

القصہ پرچہ عا

خاندانِ انیس کے مشہور مرثیہ گو جناب میر علی محمد صاحب عارف مرحوم کی مجلس سوم میں جنابِ رشید تشریف لائے۔ چہرہ اُترا ہوا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے۔ پس ماندگانِ عارف سرشک آلود آنکھوں سے اس بزرگ خاندان کے اظہارِ تعزیت کو قبول کر رہے تھے۔ کہ یکایک رشید نے پُر درد لہجہ میں فرمایا۔

"افسوس خاندانِ انیس کا شیر اُٹھ گیا۔ یاد رکھو عارف کا مثل نہ تھا۔ اب لکھنؤ کو قدر ہوگی۔ کہ مرثیہ گوئی کیا چیز ہے۔ اور فن کس کا نام ہے"۔

طرح میں سُنائے۔ اور واپس تشریف لے گئے +

انجمن دائرہ | اراکین معیار کی طرف سے ایک انجمن موسوم بہ "انجمن دائرہ" قائم ہوئی تھی جناب رشید اُس کے پہلے جلسہ میں تشریف لے گئے تھے۔ مگر اُس کے بعد پھر کبھی شریک نہ ہوئے رسالہ معیار کے ابتدائی دَور میں رشید کی متعدد غزلیں پائی جاتی ہیں۔ مگر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

جنابِ عزیز تحریر فرماتے ہیں۔ کہ جس زمانہ میں معیار کے مشاعروں کی لکھنؤ میں دھوم تھی۔ اکثر تلامذہ طرح میں اُن سے غزلیں بنوالے جایا کرتے تھے۔ خود مشاعروں میں یا شرکت ترک کر دی تھی۔ مگر کبھی کبھی طرح میں غزل یا سلام کہہ لیا کرتے تھے۔ اور ہم لوگوں میں سے جب کوئی ملتا تھا۔ تو کہتے تھے "بھائی تمہارے یہاں کی طرح میں۔ میں نے بھی کچھ کہا ہے" سلام ہوا تو ممبر پر سُنایا۔ غزل ہوئی تو آنے والے نے مکان پر سُنی +

مسئلہ تحفظ زبان | جہاں جہاں علوم کے مرکز ہیں۔ وہاں کے حضرات علم ادب کی ترقی کے متعلق گاہے گاہے اپنی سرگرمیاں مختلف صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ جن سے جلسوں میں وقتی چہل پہل ہو جاتی ہے۔ اس سے بحث نہیں۔ کہ وہ نتیجہ خیز ثابت ہوں یا نہیں۔ زمانہ جس روش پر چاہتا ہے چلاتا ہے۔ کسی کی تدبیر اُس کے خلاف کارگر نہیں ہوتی اسی طرح لکھنؤ میں بھی ایک مرتبہ "تحفظِ زبان" کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اُس وقت کے نامور ادیب۔ اور شاعر۔ غیر معمولی جوش کا اظہار کرنے لگے۔ ہر شخص بجائے خود اپنے کو تحفظِ زبان کا ذمہ دار سمجھنے لگا۔ پھر کیا تھا۔ جناب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹر مرحوم کی تحریک سے نواب باقر علی خاں صاحب رئیس لکھنؤ (خلف نواب مہدی علی خاں صاحب مرحوم) نے اپنے وسیع مکان میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا۔ تاکہ مسئلہ مذکور کے متعلق علی تدابیر پر

موجود ہوتے تھے وہاں رشید بھی ضرور ہوتے تھے۔ یہ حضرات اپنی بہترین فکروں کے نمونے پیش کرتے تھے۔ اور خاطر خواہ دادِ سخن لیتے تھے۔ مگر زمانہ شاہد ہی کہ جب رشید مغفور کے سامنے کنول آتا تھا۔ تو بزمِ مشاعرہ میں ایک سناٹا سا چھاجاتا تھا۔ اور ان کی شاعری کا چراغ جلنے لگتا تھا۔ اور جب غزل پڑھتے تھے۔ اُس وقت کا سماں قابلِ دید ہوتا تھا۔ اُن کے بعد اول تو کوئی پڑھتا نہ تھا۔ اور اگر پڑھا بھی تو گویا رسمِ مشاعرہ کا ادا کرنا سمجھیے + اس مرجعیت کا سبب وہی اُن کی سادگیِ کلام اور جذبات نگاری تھی +

فاخر مرحوم نے لکھنؤ میں ایسے ایسے مشاعرے کیے کہ زبان زدِ عوام ہیں جناب عشق مغفور اور جنابِ غضنفر علی خاں عرف بڑے بھیّا صاحب حکیم کے مشاعروں کا ذکر بھی اکثر ہوتا ہی۔ آخری وقت میں خدنگِ نظر کے مشاعرے بھی غنیمت ہوئے۔ ان مشاعروں کے بعد رشید نے گویا شرکتِ صحبتِ سخن بالکل ترک کر دی تھی۔ منشی نوبت رائے صاحب نظر نے ادبِ اُردو کی بیش قدر خدمت کی ہی۔

ایک مرتبہ ۱۹۱۰ء میں جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے مشاعرہ کیا طرح بھی

نقش فریادی ہی کس کی شوخیِ تحریر کا

یہ مہتم بالشان مشاعرہ میر تقی۔ میر علیہ الرحمہ کی "صد سالہ یادگار" میں قائم ہوا تھا پرفیسر مرزا رُسوا نے اس بزم میں ادبِ اُردو کے متعلق ایک نہایت پُرزور تقریر کی تھی۔ لکھنؤ کے تمام سخن سنج۔ اور خوش گو حضرات جمع تھے۔ جنابِ رشید سے بھی وعدہ لیا گیا۔ اور مرحوم نے بپاسِ خاطر عزیز منظور کیا۔ لیکن مشاعرہ میں تشریف نہیں لائے۔ بلکہ دوسرے روز جنابِ عزیز سے خود ملنے آئے۔ اور عذر عدمِ شرکت یہ کیا۔ کہ اگر میں یہاں شریک ہوتا۔ تو دوسروں کو شکایت کا موقعہ مِل جاتا۔ یہ کہہ کے چند اشعار

میں پہونچ گیا۔ مجھ کو دیکھ کر بادامی کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھپانے شروع کیے
میں نے جسارت کرکے کہا۔ کہ آپ کیا خراب کاغذ پر تصنیف فرماتے ہیں؟ جواب ملا۔
دو بھائی یہ معشوقوں کے خط و خال۔ ناز و ادا۔ غمزہ و عشوہ کا ذکر نہیں۔ جس کے لیے عمدہ
اور نفیس کاغذ کی ضرورت ہو۔ بلکہ مصیبت زدوں کا مرثیہ ہی۔ اُس کے لیے مصیبت زدہ
لباس۔ یعنی خستہ کاغذ ہونا چاہیے +

لطیفہ

جناب حکیم سید فضل علی صاحب عرف میرن صاحب جو رشید کے یک جہت
احباب میں ہیں۔ اُن کے بڑے صاحبزادہ صاحب عالم کی شادی۔ حکیم صاحب موصوف
کے بھائی کی دختر سے ہوئی۔ جلسۂ نکاح میں رشید بھی مدعو تھے۔ جب عقد ہو چکا
تو جناب رشید نے حکیم صاحب کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا ؎

یہ آپس کی شادی بہت مجھ کو بھائی ۔۔۔ کہ سمدھی کے سمدھی ہیں بھائی کے بھائی

اہل محفل اس برجستہ مزاج شاعرانہ سے بہت خوش ہوئے +

لکھنؤ کے مشاعرے اور رشید

آخر شباب تک رشید مشاعروں میں بہتر شریک ہوتے تھے۔ مگر جب سے
مرثیہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ مشاعروں کی شرکت کم کردی تھی۔

قریب قریب تمام مرثیہ گویوں کا یہی اصول ہی۔ کہ جب مرثیہ کی طرف زیادہ
توجہ ہو جاتی ہی۔ تو غزل گوئی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔
رشید نے گویا غزل گوئی ترک نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ فکرِ غزل کو مرثیہ میں
اس خوبی سے صرف کرتے تھے کہ غزل کا لطف بھی آتا تھا۔
جس مشاعرہ میں۔ کاملؔ۔ ماہرؔ۔ مشتاقؔ۔ جاویدؔ۔ عارفؔ۔ اوجؔ ایسے کاملین فن

طاقت آئی مگر اعضا میں نہ یکساں آئی ۔ روح بھی جسم میں آئی تو پریشاں آئی

میں نے تعریف کر کے عرض کی کچھ اور ہنس کے بولے ٹھیر و نظم کر لوں۔ غرض کہ دو منٹ
کے بعد یہ شعر پڑھا۔ ؎

ابھی بجلی بھی گرے یا تو عجب کچھ بھی نہ تھا ۔ آج کیا تھا جو سوئے گورِ غریباں آئی

مکرمی جناب مرزا امداد علی بیگ صاحب۔ برادر جناب نواب نصیر الممالک میرزا
شجاعت علی خاں بہادر۔ یہ واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ ماہ ربیع الاول
میں جب رشید مجالس پڑھنے کلکتہ تشریف لائے۔ نواب نصیر الممالک کے یہاں
مجالس شروع ہوئیں۔ ایک مجلس کسی ایرانی ذاکر نے پڑھی۔ چونکہ زبان فارسی تھی
اس وجہ سے پورا مضمون مجلس عوام نہ سمجھے۔ صرف جہاں نام حسین آیا رو دیئے۔
بعد ختم مجلس لوگوں نے جناب رشید سے خواہش کی۔ کہ اس روایت اور
مضمون کو جو اس مجلس میں ذکر ہوئے تھے۔ مرثیہ کی صورت میں نظم کر کے سُنا دیں
جناب رشید خاموش رہے۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے روز جو ممبر پر تشریف
لے گئے۔ تو بعینہ مرثیہ کا وہی مضمون تھا۔ جو مجلس گذشتہ میں لوگوں نے فارسی میں سُنا تھا
سامعین کو حیرت ہوئی۔ کہ رشید نے اس قدر جلد اور اس خوبی سے کیونکر وہ مضمون
نظم کر لیا۔ جتنے کہ آج تک حضرات کلکتہ رشید کو جب یاد کرتے ہیں۔ تو اس واقعہ کو
اُن کے کمال کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ بقول میر نواب صاحب مونس "ایک وقت
میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لینا مشاقوں کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں۔
ذیل کا واقعہ مرحوم کے انتظام شاعری کے متعلق نقل کیا جاتا ہے۔

نقل | ایک روز جناب رشید مرحوم بیٹھے ہوئے کچھ تصنیف کر رہے تھے۔

زبان کا بہترین نمونہ ہو۔ توالیِ اضافات وتراکیب فارسی سے اُن کو اُنس نہ تھا۔ میں نے تخلیہ کی صحبت میں اُن کو ایک غزل اپنی سُنائی۔

شرح جنون سلسلۂ جُنباں کیے ہوئے

بیٹھا ہوں چاک چاکِ گریباں کیے ہوئے

مطلع سُن کر کہنے لگے " بھائی پہلا مصرعہ بالکل فارسی ہوگیا" اور اشعار کی داد دی۔ جس کا ذکر میرے لیے مناسب نہیں۔ ناوان محل میں میر نواب علی صاحب کے مکان پر ایک قصیدہ خوانی کی صحبت تھی اُس میں حضرت رشید وحمید بھی تھے۔ میں نے قصیدہ پڑھا۔

شب ہوئی انجمِ تابندہ کا لشکر نکلا

پرچمِ فتح لیے ماہِ منور نکلا

اس قصیدہ میں جو اشعار زبان کا پہلو لیے ہوئے تھے اُس کی داد حضرتِ رشید نے خاص طور پر دی۔

اس سے مقصود اپنی تعریف نہین بلکہ یہ دکھانا ہے کہ نظم مین ان کا تمام تر خیال صرف زبان پر رہتا ہے اسکا التزام وہ خود بھی کرتے تھے" اور دوسرون کو بھی نہایش کرتے تھے"

جناب محشر حسب ذیل رقمطراز ہین۔

ایک روز جناب رشید کی خدمت مین سہ پہر کو حاضر ہوا گرمیون کا زمانہ تھا مسجد کے حوض مین نہا رہے تھے مجھے دیکھکر بے اختیار فرمایا بھئی محشر ابھی ابھی یہ شعر کہا ہے سُنو سُبحان اللہ۔ یہ مطلع پڑھا۔

رشید اپنے شاگردوں سے اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ تخئیل کا عزا اُسی وقت ہی۔ جب مناسب الفاظ میں نظم بھی ہو جائے۔ اگر کسی شاگرد کی غزل میں کسی جگہ کوئی ثقیل لفظ ہوتی تھی۔ تو اُس کو ایسے عمدہ لفظ سے بدل دیتے تھے۔ کہ مطلب ہاتھ سے نہیں جانے پاتا تھا۔ بلکہ اور شعر میں ترقی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک روز ایک شاگرد نے غزل پیش کی جس کا مطلع یہ تھا۔ ؎

دلِ مجروح پہ احسان تمہارا ہوتا اور اک تیر اگر زخم پہ مارا ہوتا

دوسرے مصرعہ میں بجائے، زخم پہ، کے، پاس سے، بنا دیا۔ اب شعر کو پڑھیے تو سلاستِ بیت و ترقی لفظ کا اندازہ ہو۔ حاصل کلام یہ کہ وہ خود بھی دلدادۂ زبان تھے۔ اور دوسروں سے بھی یہی اُمید رکھتے تھے۔ چنانچہ میں اپنے قول کی تائید میں۔ جناب عزیزؔ لکھنوی کا ایک خط درج کرتا ہوں۔ وھو ھذا

"زمانہ کا رنگ ہر چیز میں جاری و ساری ہی۔ اور اس سے زبان بھی مستثنیٰ نہیں رشید کے عہد میں زبانِ اُردو میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوا۔ کچھ تو بضرورت۔ اور کچھ اخبارات و رسائل اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی دریا دلی اور فیاضی سے۔ خصوصاً پنجاب سے یہ گھٹائیں اُٹھیں۔ اور ناواقفان زبان پر چھا گئیں۔ مگر رشید اپنے اصلی مرکز پر قائم رہے اور اُردو کی اصلی عظمت کو نظر انداز نہیں کیا۔

رشید کی غزل میں عُمق نہیں ہوتا تھا۔ صاف صاف شعر ہوتے تھے۔ مگر رنگ و اثر کا طمع تقریباً ہر شعر پر ہوتا تھا تخئیل میں ندرت کم ہوتی تھی مگر سلاست و تاثیر کے دریا بہتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُن کا کلام

رنگِ تغزل

رشید غزل اپنی زبان میں کہتے تھے۔ جس میں معاملہ بندی کا عنصر قوی - عاشقانہ مضامین بیشتر غزل میں شوخی اُسی قدر ہوتی ہے۔ جہاں تک وہ مذاقِ سلیم کی حدود میں رہے۔ اور مبتذل نہ ہو جائے۔ اور یہی مشکل ہے۔ مرحوم نے سلاست واثر کو اپنے کلام میں اس قدر جگہ دی ہے۔ کہ ایک معاملہ گو شاعر سے اتنی اُمید نہیں ہو سکتی -

خلاصہ یہ کہ رشید جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ صفائے بندش۔ سلاستِ بیان اُس پر کچھ اور اضافہ کر کے پیش کرتے ہیں۔ کوئی مضمون غیر مانوس ترکیبوں سے دبنے نہیں پاتا۔ اور حقیقت میں شاعری اسی کا نام ہے۔ مضامینِ عالیہ کو الفاظ کے قالب میں بند کرنا۔ ہر شاعر کا کام نہیں۔ بہت بھٹک چکے اور بھٹکیں گے۔ خیر۔ جو رنگ جس کو پسند ہو وہی بہتر۔ جس زمانہ میں ہندوستان جدید تمدن کی ایک منزل اور طے کر چکے اور فنِ تنقید کو رواج ہو گا۔ اُس وقت عوام اس کا تصفیہ کر سکیں گے +

شعر کے متعلق رشید کی رائے

میں رشید کے مذاقِ صحیح کا ذکر کر رہا ہوں۔ اور اسی سلسلہ میں ایک نقل پیش کرتا ہوں۔ جناب محشر لکھنوی تھے -

نقل

ایک دن زیارت کو میں حاضرِ خدمت ہوا۔ باتیں کرتے کرتے مجھ سے فرمایا "کیوں محشر! شاعر کو کیا کرنا چاہیے؟" میں نے عرض کی "تا امکان جذباتِ اصلی نظم کرنے کی قوت ہونی چاہیے" فرمایا "اس کے ساتھ اتنا اور بڑھا دو۔ کہ سیدھی زبان میں"

نوٹ

واقعی عربی اور فارسی کی سنگین ترکیبوں۔ اور لفظوں کا بوجھ غزل نہیں اُٹھا سکتی +

پورا پورا پرتو نظر آتا ہی۔ حالانکہ ابتداءً اُن سے رشید کو شرفِ تلمذ حاصل نہ تھا
ہاں جناب سید باقر صاحب حمید مرحوم اُن کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ معلوم ہوا کہ
رشید کی طبیعت میں فطرت نے مذاقِ سلیم کا جوہر پہلے ہی سے ودیعت کر دیا
تھا۔ جس پر صرف معمولی صیقل درکار تھی۔ جو تعشق مرحوم کی صحبت سے حاصل ہوئی۔ مگر
عشق مرحوم کے بعد رشید تعشق ہی سے اصلاح لیتے تھے +

رشید کا شعر

رشید کے تمام کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہی کہ وقتِ نظم اُن کی
پہلی کوشش صفائے بندش۔ روانی۔ اور لطافتِ محاورہ میں صرف ہوتی تھی۔
اس کے بعد درستی خیال۔ چستی مضامین کی طرف توجہ مبذول کرتے تھے۔ چنانچہ
اُن کے کلام میں بعض اوقات ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جس میں صفائی زبان کی بے جا
جد و جہد نے مضامین کو بالکل سادہ کر دیا ہی۔ نظم میں تنہی زبان۔ یا نرم زبان ہونے
کے یہ معنی کبھی نہیں۔ کہ خوبی مضامین ہاتھ سے جاتی رہی۔ بلکہ ایک زبان کہنے والے
شاعر کو دونوں پہلوؤں پر برابر کی نظر ڈالنی چاہیے۔ جس کی کوئی دوسری مثال
سوائے انیس کے نہیں ملتی۔ نرم گرم پہلو سب کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ میں
یہ نہیں کہتا۔ کہ رشید اس کلیہ سے مبرا ہیں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ اگرچہ
بعض مقامات پر اُن کے ہاں شعر بالکل سادہ نظر آتا ہی۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ خوبی ضرور
پائی جاتی ہی۔ لیکن جہاں زبان و مضامین دونوں کو کامیابی ہوجاتی ہی۔ اُس کا
کیا کہنا۔ چنانچہ ایک مطلع فرماتے ہیں۔

خاک حسرت لے گئے دل لٹنے ویراں کے گئے ۔۔۔ آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گئے

دوسرے مصرعہ میں کیسی حسن سے محاورہ صرف ہوا ہی۔ اُس کا جواب نہیں +

غزل کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن کے لیے کم و بیش تسلسل کی سخت ضرورت ہی
مثلاً قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیہ وغیرہا ہیں۔ رہا غزل کا مذاق سلیم کی حدوں میں رہنا۔ یہ بھی نہیں بیا
بلکہ وہبی ہی۔ بہرحال ایک شعر جس کو شعر کہہ سکتے ہیں اپنی خاص طرز میں پختہ اور بے مثل ہو سکتا ہی
فکر نقاد دونوں کا فرق خوب سمجھ سکتی ہی۔ لہذا مثال دینا۔ یا موازنہ کرنا تحصیل حاصل ہی۔

رشید کا سلسلۂ تلمذ

رشید اول تو ایسے طبقہ میں پیدا ہوئے تھے۔ کہ شاعری جن کی میراث تھی۔
لطف یہ کہ ننہال کے افراد مرثیہ گوئی میں طاق۔ ددھیال کے غزل گوئی میں شہرۂ
آفاق۔ ان کا وجود ایک ایسا نونہال تھا۔ جس کو چمنستانِ سخن کی دو ہواؤں نے
پرورش کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اُنھوں نے سخن کی دونوں صنفوں سے بہرۂ
کامل حاصل کیا۔ اور دونوں خاندانوں کے کمال کو زندہ رکھا۔

رشید اپنے نانا کی حیات میں سنِ تمیز کو پہنچ چکے تھے۔ اور اُن کے کمال کے
مظاہروں سے سبق حاصل کرتے رہتے تھے۔ اکثر غزلیں میر انیس کو دکھائیں۔ مگر زیادہ تر
عشق مرحوم کو۔ چنانچہ اُس مرثیہ میں جس کا مطلع یہ ہی۔

میں ہوں سلطانِ سخن مجھ سے بڑھی شانِ سخن،

علاوہ دوسرے تعلقات کے شاگردی عشق کی طرف بھی اشارہ ہی۔

میں بھی ہوں وارثِ طرزِ سخنِ میر انیس
مونسِ خلق ہوں ہیں میری زباں ہے جو سلیس

ہوں تعشق کے سبب ملکِ مضامیں کا رئیس
ایک ہی باغ کے دو پھول ہیں میں اور نفیس

خوب تحقیق ہیں بچپن سے رہی کد مجھ کو
مستند ہوں کہ ملی عشق کی مسند مجھ کو

رشید کی غزل پر زیادہ تر سید صاحب تعشق مغفور کے طرزِ خیال کا

بارہ دری میں گھنٹوں قبل مجمع ہوگیا۔ بعد انتظار انیس تشریف لائے۔ اور رونق افروز ممبر ہوئے۔ زیرِ ممبر نفیس و مونس کے ہمراہ رشید بھی بیٹھے تھے۔ انیس نے دو رباعیاں پڑھنے کے بعد فرمایا "پیارے ہماری غزل سنو" اور یہ کہہ کے سلام شروع کیا۔ جس کا یہ ایک شعر ہی۔

کہتے تھے سرورِ علی اکبر کا مرنا ہائے ہائے — کیا غضب ہوگا جو صغرا کو خبر ہو جائے گی

یہ پورا سلام اس قدر ٹیکی تھا۔ کہ چاروں طرف سے گریہ کی صدائیں بلند ہوگئیں۔

معلوم ہوا کہ انیس کا ملکۂ خداداد مرثیہ گوئی میں کسی صنفِ سخن کا محتاج نہ تھا۔ مرثیہ اُن کے لیے بنا تھا اور وہ مرثیہ کے لیے +

غزل کی اہمیت

حقیقت یہ ہی کہ یہی غزل کے دو مصرعے ایک ذہین شاعر کی پناہ کے لیے دو سنگین ستونوں کا کام دیتے ہیں۔ اگر ان کو پہلے پہل مضبوط پکڑ کے شاعری کے دوسرے دشوار گذار راستوں میں قدم بڑھایا جائے۔ تو منزلِ مقصود تک پہنچنا سہل ہی۔ وجہ یہ ہی کہ غزل جس کا نام ہی۔ اُس کا دائرہ بہت وسیع ہی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مشکل بھی۔ اس کا ہر شعر خیال کی ایک اور ایک ہی تصویر پیش کرنے کی قابلیت رکھتا ہی۔ جس کی تکمیل ایک سنجیدہ قلمکار ہی خوب جان سکتا ہی۔ یا وہ شخص جس کی نگاہوں کے سامنے مناسبت و پختگی کا فطرتی کاشانہ ہر وقت موجود ہو۔

جب ایک شعر اس طرح مکمل ہو جاتا ہے تو اب شاعر کا خیال دوسرے مضمون کو اٹھاتا ہے۔ اور اسمیں مستغرق ہو جاتا ہے اسلئے کہ اس دوران میں کسی دوسرے مضمون کو دماغ میں چھیڑ دینا پہلے خیال کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

"مشرقی شاعری" تالیف کا شکر گذار ہوں جس میں اُنھوں نے۔ انیس کے کلام
تغزل آمیز کو اُن کے مذہبی کلام۔ مرثیہ، سلام، وغیرہا سے نکال کے جمع کیا ہی۔

انیس کی غزل

رشید کے نانا میر انیس نے دوران مرثیہ گوئی میں غزل گوئی کا کبھی اظہار
نہیں کیا۔ اگرچہ یہ شغل بھی ہر صنف سخن کے مشاق کے لیے ناگزیر ہی۔ کہا جاتا ہی۔ کہ
ابتدا میں غزلیں بھی کہیں۔ اور بہت کہیں۔ جن کا مجموعہ اُن کے خاندان میں موجود ہی
یہ اشعار اُنھیں کے ہیں۔

ہوا ہی۔ ابر ہی۔ ساقی ہی۔ مے ہی	مگر تو ہی نہیں افسوس ہی ہی
لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا	اُن کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
دل لے لیا ہی یار نے مٹھی میں بند ہی	کھلتا نہیں پسند ہی یا ناپسند ہی

لیکن جب سے مرثیہ گوئی میں زیادہ انہماک ہوا اُس وقت سے مشق غزل بالکل ترک
کردی تھی۔ جناب رشید فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں ایک مرثیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ میرا
عنفوان شباب تھا۔ اور مشق سخن کی ابتدا تھی۔ میں نے غزل کہی اور نانا صاحب
کے پاس اصلاح کو لے گیا۔ مصرع طرح یہ تھا۔

وصل کی شب اُن سے باتوں میں سحر ہو جائیگی،

انیس کی آخری غزل

اُس وقت نانا صاحب قبلہ کو میں نے خلاف معمول خوش مزاج پا کے اُن کے
گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور عرض کی۔ کہ آپ بھی اس طرح میں غزل کہیے۔ میری
اس عرض پہ مسکرائے اور گلے سے لگا کے کہا بیٹا مرثیہ گوئی ہماری غزل گوئی تھی
اچھا ایکی دفعہ مجلس میں تمھاری خوشی کر دینگے اور غزل پڑھیں گے۔
تھوڑے دنوں کے بعد انیس کے نئے مرثیہ کا زمانہ آگیا۔ دلی آسام کی

لکھنؤ آئے۔ اور جنابِ رشید کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سید صاحب بارہے کے ایک پُرجوش شیعہ تھے۔ مگر دولت نہ رکھتے تھے۔ رشید کو پڑھوانے کا شوق تھا چہلم کا زمانہ تھا۔ رشید نے چار مجلسیں پڑھیں۔ تمام گرد و نواح کے سادات بارہہ جمع ہوتے تھے۔ اور اس مداحِ خاندانِ رسالت کو سچی داد دیتے تھے۔

جب مجالس ختم ہوئیں۔ صاحبِ مجلس نے ایک سو تیس[۱۳۰] روپیہ صرف مصارفِ آمد و رفت کی حیثیت سے پیش کیے۔ رشید نہیں لیتے تھے۔ مگر اُنھوں نے باصرار دے ہی دیے۔ رشید کو یہ اصرار ناگوار ہوا۔ اور کئی سال تک نہیں گئے۔ مگر سید صاحب آخرکار اس قدر مصر ہوئے۔ کہ ایک مرتبہ کہنے لگے۔ اگر آپ اب تشریف نہ لے چلیے گا تو امام حسینؑ سے فریاد کروں گا۔ رشید پھر جانے لگے۔ اور صرف مصارفِ سفر لے لیتے تھے۔ اور بس +

رشید اور غزل

انیس کے زمانہ سے کچھ قبل تک "دبگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو" کہلاتا تھا۔ مگر انیس نے اس کی تردید کردی۔ اور ثابت کر دکھایا۔ کہ لوگوں کا خیال غلط ہے۔ اُنھوں نے مرثیہ گوئی کو اس قدر وسعت دی کہ اس صنف کے مجدد کہلائے۔ چنانچہ ایک سلام میں بجا فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

مری قدر کر اے زمینِ سخن   تجھے بات میں آسماں کر دیا

غزل کے یہی معنی نہیں کہ وصال۔ ہجر۔ اُمید۔ یاس۔ حسرت وغیرہا کے مضامین ایک معینہ قافیہ و ردیف میں کہے جائیں۔ بلکہ یہی مضامین کسی دوسری صنفِ سخن میں کھپ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اُن کے نظم کرنے والے میں پوری ہی قدرت ہو کہ اُنھیں دوسرے لباس میں آراستہ کر سکے۔ میں اپنے قول کی تائید میں مولانا شہری مرحوم کی

بیچارہ اس قدر خائف ہوئے۔ کہ دعائے خوف پڑھنے لگے۔ خدا خدا کر کے جانور
دھیمے ہوئے اور رشید کو مقام مقررہ پر پہنچا دیا۔ اُس روز سے آخری دم تک
پھر کبھی شکرم پر نہیں بیٹھے۔ پالکی میں جایا کرتے تھے +

بجلی اور رشید

بجلی سے بہت ڈرتے تھے۔ جب آسمان پر تصادم ابر و باد ہوتا تھا۔ وہ
باہر نظر نہ آتے تھے۔ ذرا بھی اگر کوندے کی لپک کے آثار نمایاں ہوئے۔ رشید
گھر کے آخری کونے میں جا چھپتے تھے۔ اور رضائی اوڑھ لیتے تھے۔ اگر کہیں متواتر گڑگڑاہٹ
شروع ہو جاتی تھی۔ تو بس پھر غضب کا سامنا تھا۔ کانوں کو ہاتھوں سے بند کر لیتے تھے
اور جب تک فضائی فرشتوں کی شورش برطرف نہوتی تھی۔ اُس وقت تک وہ گوشہ
ہوتا تھا۔ اور رشید +

تکالیف کا اندازہ انسان کو اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک خود مبتلا نہو۔
یا کسی دوسرے کو اُن کے شکنجہ میں۔ عبرت کی نگاہ سے نہ دیکھ لے۔ سُنا جاتا ہی کہ
ایک مرتبہ رشید نے کسی برق زدہ شخص کو دیکھ لیا تھا۔ چونکہ بحیثیت شاعر سریع الحس
قلب پایا تھا۔ اس لیے جب بجلی چمکتی تھی۔ اُن کو اس سلسلہ میں وہی واقعہ یاد آجاتا تھا +

استغنا

ایک صاحب فیض آباد میں بالکل غریب آدمی تھے وہ جناب رشید کو
اپنے یہاں مجالس پڑھوانے کے لیے لے گئے۔ تین مجلسیں انھوں نے پڑھیں۔ وہ
بیچارہ مصارف سفر کہیں سے فراہم کر کے رشید کو دینے لگے۔ رشید نے
قطعًا انکار کیا۔ دو سال تک اپنے ہی مصارف سے گئے۔ تیسری سال جب اُنھوں نے
بہت ہی مجبور کیا۔ اور ٹکٹ ہی لا کر دے دیا۔ تو رشید نے مجبورًا منظور کیا +

ضلع مظفر نگر میں بھتولی ایک مقام ہو وہاں کے ایک باشندہ سید حافظ علی صاحب

رشید سُننے کے لیے متوجہ ہوئے۔ بیچارہ کی زبان سے پورا مصرعہ بھی نہ نکلنے پایا تھا
کہ مصاحبین نے جو اُن کے ہمراہ تھے۔ اہا۔ ہا۔ ہا سبحان اللہ کی صدائیں۔ بلند کرنی شروع
کردیں۔ اسی طرح وہ حضرت چار پانچ شعر پڑھ گئے۔ رشید صرف گردن ہلاتے رہے
نگران کی خاموشی کی اُن کو تاب نہ رہی اور کہا۔ جناب آپ کچھ نہیں بولتے۔ فرمایا "حضرت
جہاں تعریف کرنے والے موجود ہوں وہاں رشید کے بولنے کا کیا محل" اس پر
سب خاموش ہوگئے۔ اور اب رشید نے اُن کے کلام کی برمحل داد دینا شروع
کی۔ وہ حضرت بہت خوش ہوئے۔ اور بیاض رشید کے پاس اصلاح کی غرض سے چھوڑ گئے

رشید اور آلا اودل

رشید کے مکان کی پشت پر ایک وسیع زمین پڑی ہے جس پر کاشت
ہوتی ہے۔ اور چند مکان بنے ہیں۔ جن میں مزدوری پیشہ قومیں آباد ہیں۔ یہ لوگ
دن بھر کے تھکے ماندے رات کے وقت اپنے اپنے جھونپڑوں میں بے فکری سے
اوقات گذاری کرتے ہیں۔ اور اُن کی دوسری دلچسپی کے اشغال میں۔ ایک آلا اودل اُن کا
پڑھا جانا بھی ہے۔ چنانچہ حمید مرحوم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ادھر آلا اودل شروع ہوئی
اور جناب رشید کھیت کی مینڈھ پر جا بیٹھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ رات کے دو بجے
اُٹھ کر گھر آئے۔ رشید کو اُس سے غیر معمولی دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہندی کی
نظم رزمیہ ہے۔ اور اس قدر سادہ ہے کہ یورپ کی نیچرل شاعری کا جواب دیتی ہے۔ چونکہ
رشید کو مرثیہ میں مضامین رزمیہ سے کام پڑتا تھا۔ اس وجہ سے آلا اودل کی
واقعہ نگاری اور سادگی بہت پسند آتی تھی۔ اور اُس کی بہت تعریف کرتے تھے۔

خوف مضر

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رشید لکھنؤ میں کہیں مرثیہ پڑھنے جا رہے تھے
شکرم کی سواری تھی۔ اتفاق سے شکرم کسی دوسری گاڑی سے لڑ گئی اور گھوڑے بھڑک گئے

اصول تہذیبِ مجلس کی صنعت میں قائم کیے ہیں۔ اُن کی پابندی اگر کچھ اور نہیں تو انسان کو خودشناسی اور غیرشناسی کے سچّے راستہ پر ڈال دیتی ہی۔ مگر یہ نتیجہ اُس وقت نکلتا ہی جب اصولِ تہذیبِ مجلس کی پابندی میں رسم زمانہ یا دکھاوٹ کا شائبہ مطلق نہو۔ کیونکہ جہاں غرضِ اصلی مفقود ہوگی۔ پابندی تہذیب مضحک ہوجائے گی۔ اور جہاں مدعائے حقیقی مدِ نظر ہوگا۔ رُوح کو فرحت حاصل ہوگی۔

جو اصحاب ان اصولوں کے منشاء اصلی سے بیگانہ ہیں۔ وہ اُن کو محض تکلف سمجھ کے ہنستے ہیں۔ مگر وہ حضرات شاید یہ نہیں سوچتے۔ کہ اگر اس تکلّف کو درمیان سے نکال دیا جائے۔ تو جو افراد مستحقِ عزّت ہیں۔ اور جو نہیں ہیں وہ دونوں ایک ہی سطح پر آئے جاتے ہیں۔ اور جس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہی۔ کہ فضلا و جہلا۔ امرا و غیر امرا سب ایک ہی برتاؤ کے قابل ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہی۔ میں اس بحث کو طولانی کرنے میں مطلب سے دُور نکل جاؤں گا۔ لہذا یہ کہہ کے ختم کرتا ہوں۔ کہ اصولِ تہذیب کی پابندی ہر مذہب میں اُس کے رہنماؤں کی سچّی پیروی ہی۔

اے یورپ کی تہذیب کے دلدادہ نوجوانو اپنے آباؤ اجداد کے اوضاع پر پہلے ایک نظر ڈال لو پھر جو جی چاہے کرو! +

صنعتِ خاموشی رشید میں چونکہ زیادہ گوئی بالکل نہ تھی۔ اس وجہ سے جو جملہ مُنہ سے نکلتا تھا۔ مناسب محل ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحبِ دولت رشید کے پاس تشریف لائے۔ چونکہ خود بھی شاعر تھے۔ ایک مطلّا بیاض ایک مصاحب کے ساتھ تھی۔ اُن کی تشریف آوری کی غرض رشید کو اپنا کلام سُنانا تھا۔ اور بس۔ بعد رسمِ ملاقات اُن حضرت نے اجازت رشید لے کے بیاض کھولی۔

مولوی صاحب موصوف نے جنابِ رشید سے اُن کے کلام کے انتخاب کے بارہ میں گفتگو چھیڑ دی۔ اور کہا کہ فلاں مرثیہ دیجئے۔ اور فلاں سلام دیجیے۔ اور ہاں وہ رباعیات بھی مرحمت فرمایئے جو حضور نظام کی مدح میں ہیں۔ اور دیکھیے اپنی رباعیوں کا مجموعہ بھی نکال رکھیے گا۔ بھولیے گا نہیں۔ جنابِ رشید نے ان سب باتوں کا جواب اس مختصر جملہ سے دیا "بھئی میں اپنا بستہ لائے دیتا ہوں۔ گھر لیتے جاؤ۔ جو جی چاہے نکال لینا" لفظِ بھئی، تو اُن کی زبان سے ایسی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ کہ گویا انھیں کے لیے وضع ہوئی تھی۔ سرِ منبر بھی جس بند پر سامعین کی زیادہ توجہ چاہتے تھے۔ تو کہتے تھے "بھئی سنو"، اور کبھی کبھی کسی مصرعہ کے پہلے اُس کو استعمال کرتے تھے۔ تو معلوم ہوتا تھا۔ کہ جزوِ مصرعہ ہے۔

لطیفہ

شدید گرمیوں میں ایک مرتبہ جنابِ محشر ملنے گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ اثنائے گفتگو میں مرحوم نے عرقِ پیشانی رومال سے پاک کیا۔ اور مسکرا کر فرمایا "محشر! دیکھتے کیا ہو۔ یہ پسینہ نہیں ہے۔ دماغ سے مضامین کا جوہر کھنچ رہا ہے۔ میں نے رومال میں اس وقت حفاظت سے باندھ لیا ہے۔ جب ضرورتِ نظم ہو گی دیکھا جائے گا"

اگر کسی کو خط لکھتے تھے تو بہت مختصر اور مطلب خیز +

خودداری | جہاں یہ سب تھا۔ وہاں رشید میں صفتِ خودداری بھی بہت تھی۔ زیادہ خودنمائی اگرچہ کسی حد تک ہو۔ اور وہ صحیح ہی کیوں نہو۔ دوسروں کی نظروں میں زوالِ وقعت کا باعث ہو جایا کرتی ہے۔ واضعانِ قانونِ تمدن و اخلاق نے جو

اشعار پیش کش ہیں۔

عاؔلی

بار ہا گفتم بتو اے شہریار
چار یارم - چار یارم - چار یار

مرزا دبیرؔ

گو قائلِ چار یار اغیار ہوئے
ہم اُن کے شریک چار و ناچار ہوئے
پوچھیں جو نبی کے جانشینوں کو دبیرؔ
کہہ - چار ہوئے - چار ہوئے - چار ہوئے

عاؔلی

اصحابِ نبی کہ چار یار رند
چوں چار کتاب در شمار رند
دریاکی شان شکے نہ ریبے
زاں چار یکے نداشت عیبے

دبیرؔ

افضل ہیں نبی کے یار سب یاروں میں
چیدہ ہیں یہ چار لاکھ دینداروں میں
کچھ اس میں شش و پنج نہیں ہم کو دبیرؔ
اک طالب دنیا نہیں ان چاروں میں

یہ رباعیاں مثالاً اس وجہ سے لکھ دی گئیں۔ کہ ان میں کوئی امر خلافِ مذہب نہیں ہے۔ جو کسی کو ناگوار گذرے۔ جو نکتہ اس میں رکھا گیا ہے وہ ظاہر ہے۔ اور دُنیا مذہبِ اثنا عشری کے عقائد کو جانتی ہے۔ بہر حال رباعیات پرلطف ہیں۔ بحیثیتِ کلام +

تقریر و تحریر

رشیدؔ کی گفتگو کا طریقہ نہایت دلچسپ تھا۔ اول تو اُن کی سلیس زبان دوسرے نرم لہجہ۔ یہ دونو باتیں ایسی تھیں جو سُننے والے کو محو کر دیتی تھیں جواب نہایت نرم اور مختصر الفاظ میں دیتے تھے۔ جب مولوی محمد نقی صاحب شادؔماں نے اُن کے حالات قلمبند کرنا شروع کیے تو دوسرے تیسرے رکاب گنج جایا کرتے تھے اور خود جنابِ رشیدؔ یا جنابِ حمیدؔ سے استفسار حالات کرتے تھے۔ ایک مرتبہ

ظاہر ہی۔ کہ صنفِ سخن میں مرثیہ وہ صنف ہی جس میں سوائے حالات متعلقہ کے کسی دوسرے مضمون کی گنجائش ہی نہیں۔ قادر الکلامی کے تو یہی معنی ہیں کہ شاعر جس صنف کو اختیار کرے۔ اُس کے دائرے سے آگے قدم نہ نکالے +

مرثیہ کا میدان اوّل تو یوں ہی وسیع ہی۔ دوسرے یہ کہ فضائل و حالات قصۂ کربلا اس قدر وسیع ہیں کہ آج تک لکھے جاتے ہیں۔ اور ختم نہیں ہوتے۔

اسی طرح انیس و دبیر نے بھی مذہبی مسائل سے اپنے مراثی میں گریز کی ہی چنانچہ ایک مرتبہ ماہِ رمضان میں مکرمی جناب نواب بن صاحب بلیغ کے مکان پر وقتِ افطار میں بھی موجود تھا۔ ایک صاحب ضعیف العمر مرزا احمد جعفر صاحب بھی موجود تھے۔ جو مرزا دبیر مغفور کے شاگرد ہیں۔ اور جن کے پاس اُن مرحوم کے کلام کا بیشتر حصہ موجود ہی۔ اثنائے کلام میں مرزا دبیر مغفور کا ذکر نکل آیا۔ اور اتفاق سے مرثیہ کے اُس طرز پر گفتگو ہونے لگی۔ جس سے کسی گروہ کی دلشکنی نہو۔ مرزا صاحب موصوف نے بیان کیا۔ کہ پٹنہ میں ایک دفعہ دبیر مغفور سے لوگوں نے اصرار کیا۔ کہ کچھ رباعیات خلاف شانِ مرثیہ نظم کریں۔ اور پڑھیں۔ اوّل تو مرزا صاحب نے بہت انکار کیا۔ مگر جب لوگوں نے نہ مانا تو ناچار دو رباعیاں کہیں۔ جن کے چوتھے مصرعہ میں نعمت خاں عالی کے دو قطعوں کے آخری مصرعوں کا بعینہ ترجمہ کر دیا ہی۔

مشہور ہی۔ کہ عالمگیر کے بارہا استفسارِ مذہب پر نعمت خاں عالی نے جواب پیچیدہ دیا تھا۔ اُن قطعات کے مطلب میں دو نو پہلو ہیں۔ اگر چار کی تکرار کو متحد نہ دیا جائے تو مذہبِ سنن کی پیروی معلوم ہوتی ہی۔ اگر چار کو تین سے ضرب دے کے جمع کریں۔ تو مذہبِ اثنا عشری کا ماننا ثابت ہوتا ہی۔ ذیل میں عالی اور دبیر دونوں کے

ہم کو اور ماموں صاحب کو نواب صاحب موصوف کے مکان میں قیام کی جگہ ملی۔ جو مسجد جامع کے متصل تھا۔ ایک دن ہم اور ماموں صاحب اور چند دوسرے حضرات غالب کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اثنائے کلام میں ایک صاحب نے میرے مذہب کو دریافت کیا۔ غالب نے میرے ماموں کی طرف اشارہ کرکے کہا مِنْھُمْ اور میری جانب اشارہ کرکے کہا مِنّا۔ یعنی میرے ماموں کو کہا کہ سُنّی ہیں۔ اور مجھ کو کہا کہ یہ ہم میں سے ہیں۔ یعنی شیعہ ہیں"

دیکھیے حافظ شیرازی کی نسبت کیسا جھگڑا پڑا ہوا ہے۔ شیعی کہتے ہیں شیعہ تھے۔ اور اُن کا قصیدہ اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اہلِ سنّت انھیں سُنّی کہتے ہیں اور قصیدہ کو الحاقی بتاتے ہیں۔

محقق دوانی کی نسبت بھی یہی جھگڑا ہے۔ شیعہ اُن کی نسبت کہتے ہیں۔ کہ آخر زمانہ میں وہ شیعہ ہوگئے تھے۔ اور رسالۂ نور الہدایۂ علامۂ دوانی کو حجت میں پیش کرتے ہیں۔ غرضکہ اگر مذہب تحقیق کرکے لکھ دیا جائے۔ تو آئندہ نسلوں میں اس قسم کا جھگڑا پیدا نہو۔

بہرحال جناب رشید کا مذہب شیعہ تھا۔ لیکن تعصب مذہبی اُن کو مطلق نہ تھا۔ اُن کے تمام مراثی اس امر کے ثبوت کےلیے کافی ہیں۔ سُنّی و شیعہ کے مابہ النزاع مسائل کا اُن کے کسی مصنف کے کلام میں ذرا ذکر نہیں۔ حیدرآباد۔ پٹنہ۔ کلکتہ اور لکھنؤ کی مجالس میں ایک معتدبہ تعداد اہلِ سُنّت کی ہوتی تھی۔ مگر کبھی کسی نے مرثیہ کے کسی حصّہ میں کوئی مقام اپنے اعتقاد کے خلاف نہ پایا۔

بیان کر دیا ہی۔

بہرحال جس شخص کے حالات تصریحاً لکھے جائیں۔ اُس کے مذہب پر بھی پوری روشنی ڈالنی چاہیے۔ تاکہ آئندہ نسلیں اُس کے متعلق تاریکی میں نہ رہیں۔ اور قلمی فساد پیدا نہو۔ مولوی الطاف حسین حالی مرحوم نے۔ غالب کے باب میں کس قدر بکھیڑا کیا ہی۔ حتّٰی کہ اُن کو کھینچ تان کر تفضیلیہ ثابت کر دیا۔ اگرچہ تھوڑی دیر کو فرض کر لیا جائے کہ غالب سنّی تھے۔ تو مذہب تشیع میں کونسا ضعف پیدا ہوتا ہی۔ اگر شیعہ تھے تو مذہب سنّن میں کونسی کمزوری آئی جاتی ہی۔ بہرحال غالب شیعہ تھے۔

جناب صفیر بلگرامی۔ شاگرد جناب غالب۔ و مرزا دبیر۔ و سحر لکھنوی اپنے تذکرہ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں۔ (میں پوری عبارت نقل نہ کروں گا۔ بلکہ مناسب مقام)

"بندہ ۱۲۷۰ھ میں اپنے نانا حضرت صاحبِ عالم سجادہ نشین مارہرہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں حضرتِ غالب کا ذکر آیا۔ نانا صاحب سے اور اُن سے ایک خاص ربط تھا۔ میں نے خواہش کی کہ غالب کا شاگرد ہوں۔ نانا صاحب نے ایک عریضہ مع دو غزلوں کے ارسال خدمت غالب کیا۔ ۱۲۷۵ھ میں حضرتِ غالب کی زیارت کا اشتیاق ہوا۔ آرہ سے مارہرہ پہنچا۔ اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ دہلی روانہ ہوا۔ بلّی ماروں کے محلہ میں حضرتِ غالب کے پاس پہنچا۔ مجھ کو پوچھا یہ کون ہیں۔ میرے ماموں نے کہا۔ "صفیر آپ کے شاگرد" اتنے میں نواب ضیاء الدین خان صاحب تشریف لائے۔ اور دوسری باتیں چھڑ گئیں +

اگر نفیس سا مرتبہ شناس فرزند نہوتا۔ تو احتمال تھا کہ اپنے ایک بزرگ خاندان کو اپنی آئندہ عمر میں کوتاہ نظری سے دیکھتا۔

علاوہ بریں انیس مرحوم نے اُس مرثیہ مشہور میں جس کا مطلع یہ ہی

"نمک خوانِ تکلم ہی فصاحت میری"

تفاخرِ شاعرانہ کرتے ہوئے اپنے اعزائے باکمال کا ذکر کیا ہی۔ چنانچہ مونس مغفور کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

بھائی وہ مونسِ خوش لہجہ و پاکیزہ خیال | جس کا سینہ ہنرِ علم سے ہی مالامال
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال | معجزہ گر نہ اسے کہیئے تو ہی سحرِ حلال

اپنے موقع پہ جسے دیکھیئے لاثانی ہی
لطف حضرت کا یہ ہی رحمتِ ربانی ہی

طبعِ سلیم اس واقعہ کو ہرگز ہرگز نہیں تسلیم کرسکتی۔ اصحابِ تہذیب سے یہ امر بالکل بعید ہی۔ بفرضِ محال اگر انیس نے ایسا کہا بھی تھا۔ تو اس واقعہ کو پبلک میں پیش کرنے کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ یہ واقعہ اُن انسانی کمزوریوں کی شق میں آتا ہی جو کسی فردِ کامل کے حالاتِ زندگی لکھتے وقت قلم کو نظر انداز کرنا چاہیے۔

مذہب | بعض تذکرہ نویسوں نے نہیں معلوم شاعروں کے مذہب سے کیوں بحث نہیں کی ہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں نے اس میں کیا مصلحت دیکھی ہی۔ سب سے زیادہ تعجب مولانا شبلی مرحوم پر ہی۔ جو اس دورِ جدید کے مشہور انشاپردازوں میں سے تھے۔ اور یورپ کے طرزِ تحریر سے اُن کے قلم کو خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے بھی شعر العجم میں شاعر کے مذہب سے بحث نہیں کی۔ البتہ شاذ کسی کے عقائد کو مجملاً

جس کا مطلع یہ ہی۔ (نہ معلوم اصلی مرثیہ کا یہی مطلع تھا یا کچھ اور)

مجلس افروز ہی مذکورِ وفاداری خر،

میر انیس اُس وقت حوض میں نہا رہے تھے۔ مونس کی صورت دیکھ کے کچھ یاد آگیا۔ فرمایا پڑھو۔ سُنتے رہے۔ اور جب مرثیہ ختم ہوا۔ تو ایک دفعہ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے سیاہ ورقوں کو حوض کے شفاف پانی میں سفید کر دیا۔ اب حوض سے نکلے اور مونس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے گھر پہنچے۔ اور جنابِ مونس کو وہ فقرہ یاد دلایا۔ جو اُنھوں نے نواب محمد حسین خاں صاحب کی محفل میں کہا تھا۔ اور غیظ میں کہا۔

"میر نواب یاد رکھنا اگر تمہاری تعلّیوں کی یہی کیفیت رہی تو خورشید علی کی جوتیاں ہونگی اور تمہارا سر"!

تقاضائے انصاف — میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ قابل مؤلف نے۔ انیس کی زود رنجی۔ اور نازک مزاجی کے اظہار کے لیے یہ نقل لکھی ہی۔ یا مونس مرحوم کا اظہارِ سعادت اس سے مقصود ہی۔ بہر حال یہ تو ظاہر ہو گیا۔ کہ۔ انیس۔ مونس۔ نفیس۔ تین فکروں نے مل کر ایک وقت میں ایک مرثیہ تیار کیا۔ اور شاید پوری نقل کا نتیجہ بھی مؤلف کے نزدیک یہی تھا۔ مگر غائر نظر ڈالنے والوں نے۔ اُس سے ایک نتیجہ اور بھی نکالا ہی۔ اور وہ یہ کہ انیس کے اخلاق۔ اس قدر کمزور تھے۔ کہ نازک مزاجی نے اُن کو مغلوب کر لیا تھا۔ اوّل تو ایک برابر کا بھائی۔ اور کیسا بھائی۔ جس کا کمال۔ انیس کے کمال کا جزوِ قوی ہو۔ دوسرے جس کی شخصیت اہلِ علم کی نگاہوں میں ایک پایہ حاصل کر چکی ہو۔ اُس کو انیس ایسا بھائی ایسے مکروہ الفاظ سے مخاطب کرے۔ اور پھر خلوت میں بھی نہیں۔ بلکہ ایک نو عمر فرزند یعنی نفیس مرحوم کے سامنے۔ یہ فعل انیس کی ناعاقبت اندیشی پر محمول ہو سکتا ہی

آراستگی غیر ممکن۔ دُنیا کا کوئی مذہب اخلاقی مواعظ کی تلقین سے خالی نظر نہیں آتا۔
اور مذہبِ اسلام کی تو بُنیاد ہی اخلاق پر ہے +

میری رائے میں کسی کو کیسا ہی کمال کیوں نہو۔ مگر اُس کو اپنے اخلاق کو نہ بگاڑنا
چاہیے۔ اظہارِ اخلاق کا قدرتی آلہ زبان ہے۔ لہذا دوسرے سے جب گفتگو کی جائے
تو ایسے الفاظ میں جن سے حدودِ اخلاق کا پتہ چلے +

مبالغہ آمیز واقعہ

مؤلف واقعاتِ انیس نے صفحہ ۱۰۴ پر انیس مغفور کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے۔
جو مختصراً درجِ ذیل ہے۔

خود انیس مغفور نے ایک زمانہ تک لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ مگر ایک مدت
کے بعد چند مجبوریوں سے حُسینیہ افضل محل مرحومہ میں ایک مجلس پڑھی۔ جو مرثیہ
پڑھا تھا اُس کا مطلع یہ ہے ؎

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

لوگوں کو کسی طرح یہ معلوم ہوا۔ کہ اس مرثیہ کا نصف حصہ میر صاحب نے ایک
شب میں تصنیف کیا تھا۔ اتفاقاً اسی سلسلہ میں انیس کی زُود گوئی کا ذکر نواب محمد حسین خاں
صاحب مرحوم کی صحبت میں بھی آگیا۔ جس میں میر نواب صاحب مونس بھی موجود تھے۔
اُنھوں نے اپنے جادو نگار بھائی کی عظمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا "مشاقوں کے نزدیک
ایک شب میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لینا کچھ حیرت انگیز بات نہیں ہے"

لوگوں نے یہ واقعہ انیس کے گوش گذار کیا۔ اور نہ معلوم کن الفاظ میں کہ انیس
ناراض ہو گئے۔

بالمختصر۔ مونس مرحوم جب اپنا مرثیہ اصلاح لینے کے لیے انیس کے پاس حاضر ہوئے

اگر کوئی اوقاتِ نماز کے علاوہ کسی وقت پہنچا۔ تو امام باڑہ کے مشرقی کمرہ میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ جہاں صرف اتنا سامانِ تکلف نظر آتا تھا۔ کہ ایک سفید فرش ہوتا تھا اور سر پر اگر جاڑوں کا زمانہ ہوا تو روئی دار کنٹوپ اور دگلا۔ اگر گرمیاں ہوئیں تو ایک کرتہ اور لنگی باندھے ہوئے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے لے اسد

زینتِ دُنیوی سے پرہیز

اکثر اعزہ او احباب نے کہا۔ آج کل ہر شخص شانِ ظاہری کا پابند ہے۔ اور بغیر اُس کے چارہ نہیں۔ آپ کے پاس معززین آتے ہیں۔ اُن کے لیے ایک کمرہ مع سامان علیحدہ ہونا چاہیے۔ جس سے اُن کی نگاہوں میں آپ کی وقعت اور زیادہ ہو۔ جواب دیا "بس یہی ٹھیک ہے رشید بدل نہیں سکتا"

نازک مزاجی اہلِ کمال

آخری وقت میں بہت نازک مزاج ہو گئے تھے۔ اول تو پیرانہ سالی۔ دوسرے دُنیائے مرثیہ گوئی کے چند ناگوار و ناگفتہ بہ واقعات ایسے گذرے جنہوں نے رشید کو زُود رنج بنا دیا تھا۔ اگرچہ کمال کے لیے نازک مزاجی لازم ہے۔ لیکن ہر سخن موقعہ و ہر نکتہ مقامے دارد +

یہ ضرور ہے کہ ایک کامل شخص جو دُنیا کو اچھی طرح دیکھ چکا ہو۔ اُس کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہی حاصل کر چکا ہو۔ شہرت کی آخری حد تک پہنچ چکا ہو۔ اُس کی طبیعت میں ایک قسم کا استغنا پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے عوام کی نظر غرور مراد لیتی ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ وہ تمدنی نقطۂ نظر سے باہمی تعلقات کو برقرار رکھنے پر فطرتاً مجبور ہوتا ہے۔ مگر اُس کا طرزِ عمل خودداری اور بے پروائی کے نمایاں رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اخلاق ایک جوہرِ انسانی ہے۔ یا وہ زیور ہے۔ جس کے سوا کسی دوسری چیز سے انسان کی

تصور کیے جاتے تھے۔ اگر وہ پابندی وضع نہ کرتے تو اور کون کرتا +

نقل

جس زمانہ میں جنابِ محشر کا قیام کوچۂ شاہ چھڑا میں تھا۔ یہ سخت بیمار ہوئے اور جس روز بعد صحت گھر سے باہر نکلے۔ اُسی روز اُن کی عدم موجودگی میں جنابِ رشید عیادت کو تشریف لائے۔ جنابِ محشر گھر میں کہاں تھے جو ملتے۔ رشید نے کاغذ اور قلم دوات منگوائی۔ خادمہ نے پنسل کاغذ حاضر کیا۔ اُس سے فرمایا "بُوا ہم لوگ اگلے وقت کے ہیں۔ ابھی تک نہ پنسل سے لکھا ہے۔ نہ لکھنا آتا ہے۔ قلم دوات لا دو" غرض کہ قلم دوات آئی۔ اور رشید یہ شعر لکھ کر واپس گئے۔

رکاب گنج سے مشتاق دید آیا تھا
ملے نہ حضرتِ محشر رشید آیا تھا

"جنابِ عزیز تحریر فرماتے ہیں۔ میں اپنی بدبختی سے بہت کم اُن کی خدمت میں جاتا تھا۔ مگر جب ملاقات ہوتی تھی۔ تو یگانگی و محبت اُن کے لفظ لفظ سے ٹپکتی تھی۔ مجالس میں جب سرِ منبر مصروف مرثیہ خوانی ہوتے تھے۔ اور مجھ پر نظر پڑ جاتی تھی۔ تو اکثر مرثیہ روک کر اپنے قریب بلا لیتے تھے۔ اور یہ اُنکی عزت افزائی تھی۔ مرحوم کا انکسار اور ہضمِ نفس اس قدر بڑھا ہوا تھا۔ کہ بعض وقت اُن کے چھوٹوں کو یہ دھوکا ہوتا تھا کہ یہ ہمیں بناتے تو نہیں ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا"

اوقاتِ ملاقات

رشید کی ملاقات کا یہ طریقہ تھا۔ اگر کوئی اوقاتِ ناغہ کے وقت پہنچا تو مسجد میں ملتے تھے۔ اور چٹائی بچھوا دیتے تھے۔ اور مہمان کے ساتھ خود بھی بیٹھ جاتے تھے۔ باتیں کرنے لگتے تھے۔ سننے والا اس بلبلِ قندمقال کی نوا سنجیوں سے مست ہو جاتا تھا

"میر وزیر علی اخگر مرحوم ساکن گولا گنج لکھنؤ رشید کے بے تکلف اور ہم سن دوست تھے۔ دورانِ گفتگو میں ایک روز جناب محشر سے فرمانے لگے "لکھنؤ کے لوگ رشید کی استعداد علمی میں شک کرتے ہیں۔ بھائی یہ بالکل غلط ہی۔ میں اور رشید شمس بازغہ ساتھ پڑھتے تھے"

فقیر مؤلف اکثر خدمتِ رشید میں جایا کرتا تھا۔ بیشتر نمازِ مغرب کے وقت۔ اپنے دادا کی مسجد میں ملا کرتے تھے۔ ایک روز میں حاضر تھا۔ اتفاق سے ایک بلوچی سائل نے مسجد کے دروازہ پہ آکر سوال کیا "برائے خدا چیزے بدہید" رشید نے اُس سے فارسی میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "فارسی بڑی میٹھی زبان ہی" اسی طرح ایک مرتبہ میں نے جناب مولانا محمد حسین صاحب قبلہ علامہ ہندی مرحوم سے عربی میں باتیں کرتے سُنا تھا۔ مجھ کو اُس وقت تک علم نہ تھا۔ کہ رشید عربی بھی پڑھے ہیں۔ میں نے استعجاباً مولانائے مرحوم سے پوچھا "کیا رشید عربی بھی پڑھے ہیں" فرمایا "وہ کیا نہیں پڑھے ہیں"

لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم باقر حسین صاحب مرحوم۔ اور مولوی سید جواد صاحب مغفور رشید کے ہم درس اور بے تکلف دوست تھے۔

اخلاق و مزاج

رشید کا خلق بہت وسیع تھا۔ جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہی کہ آج زمانہ مداح ہی۔ چونکہ خود فقیرانہ مزاج رکھتے تھے۔ لہٰذا جہاں تک ہوسکتا تھا۔ دوسرے کے احساسات کو صدمہ نہیں پہنچاتے تھے۔ کسی سے اگر ایک دفعہ ملاقات ہو گئی اُس کے بعد جب کبھی اُس سے ملاقات ہوتی۔ وہی تپاک۔ وہی اخلاق۔ کیوں نہو پرانے زمانہ کے ممتاز افراد کی صحبتیں اُٹھا چکے تھے۔ بلکہ خود بھی انھیں کا ایک آخری جزو

پہنتے تھے۔ جب زیبِ منبر ہوتے تھے۔ تو ایک بڑا رومال دونو زانوؤں پر ڈال لیتے تھے
جس کو تہذیب ممبر کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہی +

استعدادِ علمی | یوں تو جنابِ رشید نے بہت سے باکمالوں سے درس لیا ہی۔ لیکن
یہ چند حضرات قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی سیّد اصغر شاہ صاحب سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا
میرزا محمد صاحب اخباری سے جو لکھنؤ کے ممتاز علما میں سے تھے۔ فقہ کی کتابیں
ختم کیں۔ اسی سلسلہ میں۔ مولوی محمد تقی صاحب نے۔ جنابِ رشید سے سوال کیا
"آپ نے اصولِ فقہ اُن سے نہیں پڑھے" ہنس کے فرمایا "اصولِ فقہ سے اُن کو کیا
علاقہ تھا" (اُستاد کے عقائد کا اثر شاگرد پر ضرور پڑتا ہی۔ اگرچہ کافی اثر نہو تو کم از کم
اُس کے خیالات کی وقعت ضرور ہوتی ہی۔) منطق و فلسفہ مولوی انور علی صاحب
حنفی سے پڑھا تھا۔ خلاصہ یہ کہ عربی کے درسیات کل نکلے ہوئے تھے۔ فارسی میں
بہت اچھا ملکہ رکھتے تھے +

رشید کو رَمَل میں بھی کچھ دستگاہ تھی۔ اکثر لوگ دریافت حال کرنے آتے
تھے۔ مگر پیرانہ سالی میں انکار کر دیتے تھے۔ تاہم اب بھی علی الصباح عورتیں اپنے
بچوں کو لیے ہوئے آتی تھیں۔ اور اُن مختلف امراض کے تعویذ لے جایا کرتی تھیں
خصوصاً اگر کوئی مریض گُرُل میں مبتلا ہوتا تھا۔ تو جنابِ رشید کا صرف تین روز
پڑھکر گلے پر ہاتھ پھیر دینا شفا بخشتا تھا۔ اُن کے بعد گُرُل کی شکایت رکھنے والے
حمید و سعید کے پاس آتے تھے۔ اور شفا پاتے تھے۔ رشید کی استعدادِ علمی کی
تائید میں۔ ذیل کی دو سطریں جنابِ محشر کی زبانی نقل کی جاتی ہیں۔

حلیہ قد لانبا، بدن چھریرا، کھڑا نقشہ، ماتھا بلند، سوتواں ناک، آنکھیں متوسط، پتلی میں کسی قدر نیلاہٹ، ہونٹ پتلے، رنگت گوری لیکن سُرخی غالب ہونے کی وجہ سے تیز گندمی رنگ کہا جاسکتا ہے۔ چہرہ پر بہت متانت تھی۔ داڑھی خشخشی سر پر پٹے +

یہ حُلیہ جناب رشید کی پیری کا ہے۔ اس سے اگر اُن کی حالتِ جوانی کا اندازہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے۔ کہ جوان خوش گِل ہونگے۔ خود فرماتے تھے " کہ جب غدر کی پریشانیوں کے باعث سے۔ میر انیس میرزا عباس صاحب کے مکان واقع منصورنگر میں۔ مع اہل وعیال چلے گئے تھے۔ تو میں بھی ساتھ تھا۔ بلوائیوں کی لوٹ مار جاری تھی۔ خاندان کے تمام مرد۔ اوقاتِ مقررہ پر روز وشب باری باری پہرہ دیتے تھے۔ میری کمر میں بھی سنتر منڈ کی بندھی ہوئی تھی"۔ خلاصہ یہ کہ رشید بھی کبھی لکھنؤ کے بانکے جوان ہونگے +

وضع ولباس

آخر عمر کی وضع بالکل سادی تھی۔ مہین تنزیب کا انگرکھا پہنتے تھے۔ اُس کے نیچے کرتہ نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی جالٹین کا شلوکہ کہنیوں تک کا پہن لیتے تھے۔ دو پلڑی ٹوپی چکن کے کام کی پہنتے تھے۔ پنج گوشیہ ٹوپی جو اکثر مرثیہ خواں پہنتے ہیں۔ آپ نے کبھی نہیں پہنی۔ یہی دو پلڑی ٹوپی اُن کا خاندان بھر پہنتا ہے۔ اب تک انیس کے خاندان والے پنج گوشیہ ٹوپی پہن کر زیبِ ممبر ہوتے تھے۔ اور عشق کے خاندانی دو پلڑی ٹوپی پہن کے۔ یہی امتیازی فرق سر ممبر خاندانی سلسلہ ظاہر کرتا تھا۔ (لیکن سوائے بڈھوں کے پنج گوشیہ ٹوپی کا رواج اُٹھ گیا) رشید نے جوانی میں بھی گھٹنا نہیں پہنا۔ کلی دار پائجامہ

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" (رشید کو میر حسن علیہ الرحمہ سے منسوب کرنے کو اتنی عبارت کافی ہے۔)

رشید کی سسرال

جناب رشید کا عقد میر عسکری صاحب مرحوم کی دختر سے ہوا تھا۔ جو انیس مغفور کے منجھلے بیٹے تھے۔ اور اپنے والد ماجد ہی کے ساتھ رہتے تھے شعر و سخن سے کم دلچسپی تھی۔ اس وجہ سے غیر معروف ہیں +

پیارے صاحب رشید

نام و سال ولادت

آپ کا نام سید مصطفےٰ میرزا تھا۔ فرماتے تھے "سال جلوس واجد علی شاہ میرا سالِ پیدائش ہے"۔ چونکہ تاریخ جلوس واجد علی شاہ روز دوشنبہ ۲۹ صفر ۱۲۶۳ھ ہے۔ لہذا یہی رشید کا سنِ ولادت ہے۔ صغر سنی میں خاندان کے بزرگ افرادِ محبت سے پیارے پیارے کہا کرتے تھے۔ اس لیے یہ عرف ہوگیا۔ کیا تعجب ہے کہ یہ لفظ پہلے میر انیس کی زبان سے نکلی ہو۔ اور انھیں کے اتباع میں اور لوگ بھی کہنے لگے ہوں۔ انیس کے تمام نواسے اور نواسیوں۔ اور پوتے پوتیوں میں رشید سب سے بڑے تھے۔ ظاہر ہے کہ پہلی اولاد کو انسان کس قدر محبت کی نگاہوں سے دیکھے گا۔

آپ کے والدِ ماجد کا نام سید احمد میرزا صابر، بن سید محمد میرزا انس، بن سید علی میرزا، بن سید ذوالفقار علی میرزا ہے۔ اسی طرح سلسلۂ نسب امام رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے +

حضرت رشیہ

جنابِ صابر نے ۲۱ شوال روزِ چہار شنبہ ۱۳۱۱ھ بعمر ۷۲ سال کی عمر پاکر جانب ملکِ بقا رحلت کی +

مؤلف نے یہاں تک رشید کی دادھیال کے حالات لکھے۔ لہذا اب مختصراً نانہالی خاندان کو بھی بیان کر دیا جائے اگرچہ صرف یہ کہدینا کافی ہی کہ رشید میر انیس کے نامی نواسہ ہین۔ لیکن بہ مزید احتیاط کچھ نانہالی سلسلہ بھی حوالہ قلم کیا جاتا ہی

رشید کی نانہال

رشید کے نانا ناخدائے سخن میر ببر علی انیس مغفور۔ بن میر مستحسن خلیق۔ بن میر حسن دہلوی تھے۔ جن کی مثنوی اور کلیات مشہورِ آفاق ہیں۔

میر حسن مرحوم نے اپنا خاندانی سلسلہ اپنے دیوان کے مقدمہ میں تحریر کیا ہی لہذا مختصراً (واقعات انیس سے لے کر) یہاں نقل کیا جاتا ہی۔ کیونکہ اُس سے زیادہ معتبر تحریر اس سلسلہ میں دوسری ممکن نہیں۔ وہ عبارت یہ ہی۔

"اما بعد بر سخن دانانِ شاطر و دانشورانِ ماہر مخفی نماند کہ اصل این مؤلف (میر حسن) ابن میر غلام حسین بن میر عزیز اللہ بن میر ہدایت اللہ بن میر امامی موسوی۔ از شاہ جہان آباد ہست۔ میر امامی موسوی در وقت شاہ جہان باز ہرات آمدہ بہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردید۔ فاضل متبحر۔ و متقیہ بے مثل بودند۔ گاہ گاہ بہمت تفریح طبع فکر شعر ہم می نمودند۔ پس این عاجز سخن را شاعری اجداد المیت نہ امروزی۔ وقبلہ گاہی سلمہ اللہ تعالٰی با این ہمہ قدرتِ علم چون طبع سامعان در خود سمع بلند نیافتند۔ بقدر حوصلہ آنفا بطرف ہزل توسن قلم راندند۔ بحکم آنکہ

یا گلزارِ ارم ہی وزبار گرم ہے۔ حاشیہ نشین اپنے اپنے اعزاز و مناصب کے مطابق شاہی مسند کے دونو پہلوؤں پر بیٹھے ہیں۔ درِ دولت کے پردوں سے اطمینان کی ہوائیں آرہی ہیں۔ شغل سور و سرور جاری ہے۔ کہ ریزیڈنٹ یکایک دربار میں داخل ہوتا ہے اور گرچ کی سلامی دے کے ایک شقۂ سرکار کمپنی پیش کرتا ہے۔ جس میں ایک طویل عبارت نظر آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"معاہدۂ انشاءع کی پابندی آپ سے نہ ہو سکی۔ لہذا انتظام سلطنتِ اودھ خود کمپنی کرے گی۔ آپ کو اگر کچھ بطورِ عذر کہنا ہو تو کلکتہ پہنچ کر گورنر جنرل سے کہہ سکتے ہیں"

چہرہ کے مختلف تغیرات اور ایک عرصہ کے معنی خیز سکوت کے بعد اب بادشاہ نے گردن اُٹھائی۔ اور جنابِ صابر سے پوچھا "اب بھی کچھ کہتے ہو کہ عرض کیا "بالکل چھوڑ دیا" فرمایا "کیوں" عرض کیا "حضور کے تشریف لانے کے بعد جی نہ چاہا" جس کا جواب یہ ملا۔ کہ جنابِ صابر مشقِ سخن جاری رکھیں اور اصلاح کے لیے کلکتہ بھیج دیا کریں۔ اس کے بعد تبرکات کے حاضر کیے جانے کا حکم ہوا۔ تبرکات کے خوان پیش کیے گئے۔ بہت خوش ہوئے۔ دُرِ نجف کی تسبیح کو اُٹھا کے آنکھوں سے لگایا جنابِ صابر کو ایک بیش قیمت دوشالہ اور ایک رومال عطا ہوا +

عبادت | یہ معمول تھا کہ جنابِ صابر بلاناغہ تین بجے رات سے اُٹھتے تھے۔ اور بعد نمازِ صبح تلاوتِ قرآن مجید اور وظائف میں آٹھ بجے تک مصروف رہتے تھے۔ خدا پرستی جیسی قناعت کے وسیع میدان میں ہو سکتی ہے۔ دولت کے بندے اکثر اُس سے نابلد ہیں +

کہ خود اُن کے والد بیگم صاحبہ کے نمک خوار تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس ملازمت کو قبول نہ کرتے تو گویا جناب اُنس کی نافرمانی تھی۔ جس کو صابر ایسا صاحب استعداد اور فرماں بردار فرزند کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

صابر کا سفر کلکتہ اور واجد علی شاہ معزول

ملکہ جہاں کی عدم موجودگی میں جس دیانت داری اور بیداری سے جناب صابر نے کام کیا تھا۔ اُس کے صلہ میں علاوہ اعتراف خدمت کے کافی صلہ بھی ملا تھا جس وقت ملکہ جہاں سفر عراق سے واپس آئیں تو کچھ تبرکات (جیسا عام قاعدہ ہے) اپنے ہمراہ لائیں۔ اور چاہا کہ واجد علی شاہ کے پاس بھی تحفۃً کچھ تبرک بھیجا جائے۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ کس کے ہاتھ بھیجا جائے؟ یا تو جناب اُنس خود لے جائیں۔ یا چھوٹے داروغہ صاحب (جناب صابر) کو یہ خدمت سپرد ہو۔ ملکۂ جہاں نے یہ طے کیا۔ کہ آخر الذکر کو یہ سربلندی بخشی جائے۔ چنانچہ جناب صابر تبرکات لیکے کلکتہ پہنچے۔ اُس زمانہ میں بادشاہ نقار خانہ واقع مٹیا بُرج میں تشریف فرما تھے۔ جناب صابر در دولت پر حاضر ہوئے چوبدار شاہی نے با ادب عرض کیا۔ "ظل اللہ فرستادۂ نواب ملکہ جہاں بیگم صاحبہ حاضر ہے"۔ ارشاد ہوا۔ "بلالو"۔ جناب صابر دربار میں گئے۔ مجرا بجا لائے۔ فرمایا "بیٹھو"۔ پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اور فرمایا "تم تو ہمارے نوکر تھے"۔ جناب صابر نے عرض کیا "جی جہاں پناہ"۔ پھر فرمایا "تم تو بالکل بڈھے ہو گئے"۔ عرض کی "جب حضور سا آقا سر پر نہ رہا تو جوانی کہاں"۔ اس عقیدت آمیز جواب نے شاہ کے دل پر اثر کیا۔ گردن جھکالی اور کئی منٹ تک خاموشی کا عالم طاری رہا۔

اظہار سکوت بادشاہ

اس فقرہ نے واجد علی شاہ کے سامنے اُن کی عظمت کا پُرانا نقشہ پیش کر دیا۔ گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ لکھنؤ ہے اور قیصر باغ کی بارہ دری پر جلوہ فرما ہیں

تو زہرہ محل کی طرف سے ایک محبت نامہ (شکایت نامۂ معشوقانہ) نظم ہو کر جایا کرتا تھا۔ جو جنابِ صابر نظم کیا کرتے تھے۔ مقتدر مکتوب الیہ کو معلوم تھا۔ کہ صابر نظم کرتے ہیں۔ لہذا تبرکاً اُس پر اصلاح بھی دے دیتے تھے +

جب ۵۔ رجب سنہ ۱۲۷۲ھ میں واجد علی شاہ کو سرکار کمپنی نے کلکتہ روانہ کر دیا تو لکھنؤ میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ متوسلین شاہی کی حالتوں کا تغیر اور ملازمین بندگانِ عالی کا تفکر میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ صرف یہ کافی ہے کہ لکھنؤ کی روشن فضا میں تاریکی پھیل گئی عیش و عشرت کے ستارے دُھندلے ہو گئے۔ فراغت کا چاند غروب ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ جس کا جدھر مُنہ اُٹھا اُدھر چلا گیا۔ واجد علی شاہ کے خاص وابستگانِ دولت اُن کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے۔ (فقیر اشہر کے پرنانا میر راسعادت خان داروغہ چاندی خانۂ شاہی بھی ہمرکابِ پادشاہ رہے اور ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۲ھ کلکتہ ہی میں انتقال کیا) +

قناعت

اس مقام پر مجھ کو یہ ضرورت ہوئی کہ جنابِ صابر کی قناعت کے متعلق کچھ لکھوں کیونکہ یہ وقت اُن کے لیے بہت سخت تھا۔ واجد علی شاہ سے شفیق آقا سے جدائی ہو چکی تھی۔ غدر کی ہند سوز آگ نے بڑے بڑے خاندانوں کو برباد کر دیا تھا۔ خصوصاً دہلی اور لکھنؤ تو خاص مرکزِ تباہی تھے۔ رؤسائے باقیماندہ کے پاس اس قدر سرمایہ خود نہ رہا تھا کہ اپنی ہی آبرو قائم رکھتے۔ اور جن کے پاس تھا اُن سے کسی کو چنداں امید پرورش نہ تھی +

جنابِ صابر کسی کے پاس نہ گئے۔ میر انیس مغفور یا اُن کے والد ماجد میر اُنس مرحوم جو ماہانہ تنخواہ دیتے تھے۔ اُسی پر بسر اوقات تھی۔ اُن کو حالتِ عسرت میں دیکھ کر لوگوں نے کہا۔ آپ ملازمت کیوں نہیں کرتے۔ جواب دیا جسب دل خواہ قدر دانوں کو کہاں سے لاؤں

ملازمت

بہت دنوں کے بعد نواب ملکۂ جہاں کے یہاں اس وجہ سے سلسلہ ہو گیا تھا۔

کربلائے معلی جانے لگیں۔ تو جناب احمد میرزا صاحب صابر اپنے والد کے عہدہ کے ذمہ دار ہوئے۔ چند دنوں کے بعد جب میر انیس کا انتقال ہوگیا۔ تو یہی مختار عام ہوگئے اور پچاس روپیہ ماہانہ مقرر ہوئے۔

واجد علی شاہ اور جناب صابر

عہد واجد علی شاہ میں جناب صابر شاہی ملازم تھے یعنی مجرائیوں میں اسم تھا۔ میر صاحب کی شرافت و دیانت ذاتی نے اس قدر بادشاہ کے دل میں جگہ کر لی تھی کہ انھوں نے آخر کار اپنی بی بی زہرہ محل کے یہاں کی داروغگی ان کے سپرد کر دی تھی۔ ایک روز جناب صابر دربار میں حاضر تھے۔ بادشاہ نے ان سے مخاطب ہو کے پوچھا "تم محمد میرزا انس کے صاحبزادہ ہو" انھیں نے جواب میں عرض کیا "جان عالم ہاں" بادشاہ نے فرمایا "تم آئندہ اپنے کلام پر مجھ سے اصلاح لیا کرو" بنا بر حکم ہمایون۔ جناب صابر نے چند غزلیں شاہ کو دکھائیں +

یہ زمانہ لکھنؤ کی بہار کا تھا۔ ہر شخص بے فکر ہر طرف سامان عیش و طرب موجود۔ گلزار ارم سے خوش آیند نغموں کی صدائیں اٹھ اٹھ کے تمام خوش اوقات حلقوں میں اپنا دلکش اثر پھیلا چکی تھیں۔ اور الناس علیٰ دین ملوکھم کا مفاد صرف با محل تک پہنچ چکا تھا۔ ایسے مقامات پر جناب شعر کو معیار رسوخ ہو سکتا ہی ظاہر ہی۔ فطرت سے لکھنو والے مجبور تھے۔ ورنہ اس وقت کا ذوق شعر گوئی تو یہ کہتا تھا کہ اگر بس چلتا تو سارا لکھنؤ نظم میں باتیں کیا کرتا۔

زہرہ محل کو داروغہ کیا عطا ہوا تھا۔ ایک شاعر واجد علی شاہ کی طرف سے ملا تھا کہ زہرہ محل کی جانب سے نظمًا چھیڑ چھاڑ ہوا کرے۔ اور اس طریقہ سے لطف محبت جانبین کو حاصل ہو۔ چنانچہ جب جان عالم کی عدم تشریف آوری کو دو چار روز کا عرصہ گذر جایا کرتا تھا

انیس سے سلسلہ | واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے ایک سال قبل یعنی ربیع الاول سنہ ۱۲۶۲ ہجری میں جنابِ صابر کا عقد فردوسی ہند جنابِ انیس مرحوم کی صاحبزادی کے ساتھ ہوا۔ جن کا انتقال رشید کے سامنے ہوا + انیس مرحوم ان صاحبزادی سے خصوصاً بہت محبت فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جنابِ صابر بھی بہت محبوب تھے۔ جنابِ رشید فرماتے تھے کہ نانا جان مہینہ میں دو ایک مرتبہ والدہ کو دیکھنے ضرور تشریف لاتے تھے اور جنابِ اُنس مغفور کے ساتھ کھانا نوش فرماتے تھے۔ جتنے عرصہ تک قیام رہتا تھا ان دونوں بزرگوں میں فنِ شعر کے متعلق اس قدر دلچسپ اذکار ہوتے رہتے تھے گویا دو بلبل چہک رہے ہیں۔ خاندان کے نوجوان رشید، حمید، سعید، جدید وغیرہم حاشیہ نشین ہوتے تھے۔ اور اس دعوتِ علمی سے ذخیرۂ معلومات لے کر اُٹھتے تھے۔

نقل | جنابِ حمید مرحوم فرماتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جمعرات کو جناب نانا صاحب (یعنی جنابِ انیس) حسبِ معمول تشریف لائے۔ جناب دادا صاحب (یعنی جناب اُنس) سے گفتگو ہونے لگی۔ اثنائے کلام میں دادا صاحب نے جرأت مرحوم کا یہ شعر پڑھا۔

ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شامِ ہجراں کی * وہ اپنے شغل میں ہیں بال دھو کے کھولے ادھر باندھے

نانا صاحب نے بہت تعریف کی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کانوں کے پاس لیجا کے اور چاروں اُنگلیوں کو یکے بعد دیگرے ایک دَوری حرکت دے کے۔ دوسرے مصرعہ کو اس طریقہ سے ادا کیا۔ کہ اب تک وہ تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔ واقعی میر صاحب پڑھتے کیا تھے شعر کی تصویر کھینچتے تھے +

معاش | جنابِ اُنس کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ جب نواب ملکۂ جہاں (زوجۂ محمد علی شاہ)

جنابِ صابر نے ہمیشہ اسی کا بنا یا ہوا جوتہ پہنا۔ کیا وضع کے پابند لوگ تھے۔

شوق تعلیم
افراط نظم سے
پرہیز

جنابِ صابر بڑے ذی استعداد تھے۔ مولوی انور علی صاحب فرنگی محلی مرحوم سے درسیات ختم کیے تھے۔ اور بجائے خود کتب بینی سے اس قدر قوتِ علم بڑہائی تھی۔ کہ طالبانِ علم گھر پر درس لینے آتے تھے۔ ان کے نمایاں شاگردوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ حکیم سیّد باقر مرحوم۔ میر اولاد علی مرحوم۔ شیخ ہادی علی مرحوم۔ میر عسکری مرحوم۔ شیخ ضامن علی مرحوم+ جنابِ صابر تینوں زبانوں (یعنی عربی۔ فارسی۔ اُردو) میں شعر کہتے تھے۔ اور شاگردوں کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے۔ کیفِ علم میں اس قدر سرشار تھے۔ کہ کبھی صنفِ شعر میں زیادہ نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ اس قدر کہا کہ قابلِ اشاعت ہوتا۔

شاذ سے قطع نظر کرکے قاعدہ ہی کہ ایک صاحبِ استعداد اگر فطرتاً ذوقِ شعر رکھتا ہی۔ تو اُس کو کبھی اس حد تک نہیں پہنچاتا۔ کہ شاعری کے بڑھتے ہوئے خیالات اس کو مسائلِ علمیہ کی فکر سے باز رکھیں۔ جو کیفیت شاعر پر دورانِ نظم میں طاری ہوتی ہی۔ اور جن کاوشوں سے وہ ایک خیال کو نظم میں ادا کرنا چاہتا ہی۔ اور کامیاب ہوکر خوش ہوتا ہی۔ اسی طرح ایک درس دینے والا مسائلِ علمیہ کے حل میں غرق ہوکے وہ لطف اُٹھاتا ہی کہ فضلا ہی خوب سمجھتے ہیں +

شاعر کا بدلِ ما یتحلّل دادِ سخن ہی۔ اور مدرس کے رُوحانی سرور کا سبب یہ ہی کہ جو کچھ اُس نے تقریر کی ہی۔ وہ پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جائے۔ بہر حال جنابِ صابر نے اپنے وقت کو صرفِ علم کر دیا۔ اور شعر کی طرف توجہ کم کی۔ آتش و ناسخ کے مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں۔ اور ان دونوں سے دادِ سخن لی ہی +

کرتے تھے۔ لہذا دوبارہ زیارت کربلائے معلّٰی پر آمادہ ہوگئے۔ گویا ارادۂ ہجرت کرلیا۔ میر عشق کے انتقال کے بعد واپس آئے۔ اور پھر وہ شہرت حاصل کی کہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے ایک فرزند سیّد نواب میرزا تعلّق مرحوم تھے۔ یہاں ان دونوں حضرات کے مفصّل حالات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مقصود میر ارشید کے حالات سے ہی۔ روشِ تحریر اس طرف کھینچ لائی تو ان حضرات کا بھی مجملاً ذکر ہوگیا۔

سیّد صاحب نے ستّر سال کی عمر پائی۔ ۲۴ رمضان المبارک روز شنبہ ۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا۔ باغ میر عشق میں زیر امام باڑہ ایک حجرہ ہی۔ اُس میں مدفون ہوئے۔ ناسخِ وقت جناب مولوی علی میاں صاحب کامل مغفور نے یہ تاریخ وفات کہی

از زبانِ ہاتفِ غیبی بہ ناسخ گو بمش ۔۔۔ رفتہ سوئے مجلس جانِ بہ پیر آں جناب
۱۳۰۹ھ

احمد میرزا صاحب صابر

جنابِ صابر۔ یہ محمد میرزا صاحب اُنس کے منجھلے بیٹے اور جنابِ رشید کے والدِ ماجد تھے۔

حلیہ و لباس | رنگت گوری تھی۔ ماتھا بلند۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ کثرتِ کتب بینی سے نظر کمزور ہوگئی تھی۔ موٹے تازے تھے۔ رسمِ قدیم کے موافق سر پر پٹے تھے۔ اعضا میں بہت مناسبت تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ خوب صورت تھے وضع بالکل سادی تھی پنجگوشہ ٹوپی پہنتے تھے۔ کُرتہ نیچا۔ آٹھ کلی کا شروع کا پائجامہ ہوتا تھا۔ جوتہ گھیتلا اشرفی کا بر علی کے ہاتھ کا بنایا ہوا۔ بر علی اُس وقت لکھنؤ میں گھیتلے جوتہ کی ساخت میں بہت مشہور تھا اکثر رؤسا و شرفائے شہر اس کے ہاتھ کا جوتہ پہنتے تھے۔ چنانچہ میر انیس میر مونس

وعشق کے جیّت مرثیہ گو مثلاً عروج، رفیع، مؤدب، فائق، حسن، قدیم، فرید، رونق افروز ممبر ہوتے ہیں۔ یہی ایک مرثیہ ہر ایک کی نسبت سال بھر تک ایک رائے قائم کرا دیتا ہی۔ سنجیدہ طبیعتیں نقادانہ نظر ڈال کے کامیابی کی مختلف تعریفوں سے ہر ایک کو سرفراز کرتی ہیں۔ جو اس امتحان گاہ میں عہدہ برآ ہو گیا۔ اُس کی امیدوں کا کیا پوچھنا۔

جنابِ عشق نے بتاریخ ۲۴ شعبان ۱۳۱۳ھ روز دوشنبہ انتقال فرمایا۔

سید میرزا تعشق

لکھنؤ میں سیّد صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ غزل اور مرثیہ گوئی دونوں کے بادشاہ تھے۔ خداداد طبیعت نے مرثیہ گوئی کا ایک نیا اور ہر دل عزیز رنگ ایجاد کر لیا تھا۔ جس مشاعرہ میں غزل پڑھ دیتے تھے۔ سامعین بےتاب ہو جاتے تھے۔ واد دینا کیسا کلام نے وہ اثر پایا تھا۔ کہ لوگ رو دیتے تھے۔ ان کے کچھ مرثیے اور مختصر سا دیوان غزلیات طبع ہو گیا ہی۔ دیوان غزلیات جناب ابر مرحوم اڈیٹر رسالہ معیار چھپوایا

جنابِ تعشق سے میر انیس صاحب بہت محبّت کرتے تھے۔ بلکہ ان دونوں بزرگواروں میں برادرانہ مراسم تھے۔ ایک معتبر ذریعہ سے سُنا گیا ہی۔ کہ میر انیس مغفور اکثر اپنا نیا مرثیہ آپ کو سُنا دیتے تھے۔ جس کی وجہ سوائے انتہائے الفت کے اور کیا ہو سکتی ہی۔

کم شہرت کی وجہ — سیّد صاحب نے اپنا زیادہ حصّہ عمر کربلائے معلّیٰ میں صرف کیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ میر عشق مغفور کا چراغ لکھنؤ میں جل رہا تھا۔ مگر انھوں نے جو نئے مرثیے کہے اور مجلسوں میں پڑھے۔ تو مرجعیت عام ان کی طرف ہونے لگی۔ سمجھے کہ اگر میں یہ سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔ تو زمانہ میر عشق کا مدِ مقابل بنائے دیتا ہی۔ جس کو یہ ناپسند

حسین میرزا عشق

لکھنؤ کے نامی مرثیہ گویوں میں تھے۔ دیوان اور مرثیوں کی جلد بھی چھپ چکی ہے۔
ان کا کلام اصولِ شاعری کی میزان میں تُلا ہوا ہے۔ جہاں انیس و دبیر کے کلام کے
لوگ مشتاق ہوتے تھے۔ وہاں ان کا کلام بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔
اول الذکر دونوں صاحبوں کی شہرت کے برابر برابر ان کا شہرۂ کمال بھی تھا۔ محقق فن
ایسے تھے۔ کہ دوسرا نگاہوں میں نہیں سماتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ لکھنؤ کے باکمالوں کی فہرست
اول میں ان کا نام نامی بھی نظر آتا ہے۔ اب ان کے پوتے جناب عسکری میرزا صاحب
مؤدب، آبائی جاگیرِ نظم کے مالک ہیں۔ اور آج کل لکھنؤ کے نامی مرثیہ گویوں میں شمار
کیے جاتے ہیں۔ اور خوب کہتے ہیں۔

جنابِ مؤدب کو رشید مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ جس طرح جناب
رشید نے اپنے مرثیہ ' میں ہوں سلطان سخن مجھ سے بڑی شان سخن ' میں اکیسویں بند پر

' مستند ہوں کہ ملی عشق کی مسند مجھ کو '

کہہ کے شاگردی عشق پر ناز کیا ہے۔ اسی طرح جنابِ مؤدب نے ذیل کی رباعی میں
فخراً شاگردیِ رشید ظاہر کی ہے۔

عمو ہیں رشید اُن سے یہ رشتہ ہے	دادا مرے عشق۔ اُن کے چچا شاگرد کیا ہے
یہ عشق کے شاگرد ہیں شاگرد رشید	تلمیذ کا یہ سلسلہ بھی اچھا ہے

رجب کی ستائیس تاریخ اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ میں سجاد حسین صاحب
ایک مجلس کرتے ہیں۔ اُس میں جناب مؤدب اپنا نیا مرثیہ سُناتے ہیں۔ اس ماہ رجب
کی چوبیس تاریخ سے نئے مرثیوں کی مجالس شروع ہو جاتی ہیں۔ اور خاندان انیس و دبیر

شعر گوئی کا مزا اے اُنس کب باقی رہا
رو دیا جب حضرتِ ناسخ کی شفقت یاد کی

کیا مزے تو نے دیے ہیں رحمت اے تاثیرِ ضعیف ۔۔۔ لب تک آ سکتا نہیں شکوہ ہمارے دل میں ہے

رات بھر دل سے رہیں رنج و تعب کی باتیں ۔۔۔ فرقتِ یار نے سُنوائیں غضب کی باتیں

اتنی تخصیص پہ مسرور ہے دل واہ رے دل ۔۔۔ چشم پوشی ہے رقیبوں سے اشارے ہم سے

طول میں ہیں جو ترے قد کے برابر گیسو ۔۔۔ کہیں برپا نہ کریں فتنۂ محشر گیسو
واہ ری مہر و وفا عاشقِ گیسو جو مُوا ۔۔۔ پھر نہ چھوڑے کبھی اُس شوخ نے مُنہ پر گیسو

اولادِ اُنس | محمد میرزا صاحب اُنس کے پانچ بیٹے تھے۔
حسین میرزا عاشق ۔ احمد میرزا صابر ۔ سید میرزا تعشق ۔ سید عباس میرزا صبر
سید نواب میرزا عاشق +
ان سب حضرات کی شاعری کا سلسلہ اُستادِ وقت جناب شیخ ناسخ مغفور سے ہے
ان حضرات کا حال بھی مختصراً درجِ ذیل ہی۔

اشعار میر اُنس مغفور (شاگرد ناسخ)

رسا جو اُلفتِ زُلفِ دراز ہو جائے | کمندِ بامِ حقیقت مجاز ہو جائے
تمہیں لحد میں اُتارو تمہیں پڑھو تلقیں | کہیں تو صحبتِ راز و نیاز ہو جائے
عطا ہو ضبط مجھے یا اجل سے کچھ کہدو | کوئی تو صورتِ اخفائے راز ہو جائے
غرض وفا و جفا سے نہیں وہ چال چلو | کہ مجھ میں غیر میں کچھ امتیاز ہو جائے

وفورِ شوقِ شہادت سے بے قرار آئے | حضور جلد برآمد ہوں جاں نثار آئے
کسی طرح نہ ملا قاصدوں کو خط کا جواب | ہزار بار گئے اور ہزار بار آئے

جان دی پر کی نہ منت اُس ستم ایجاد کی | بد دماغی دیکھنا میرے دلِ ناشاد کی
اپنی اُلفت کا مآل اچھا نظر آتا نہیں | اُن کو عادت بھولنے کی ہم کو عادت یاد کی
درد و غم سے بڑھ گیا ہی ربط ہجرِ یار میں | اب قیامت پر گئی شادی دلِ ناشاد کی
مجھ سے اک بُت کی محبت میں کنارہ کر گیا | اب خدا صورت نہ دکھلائے دلِ ناشاد کی
کرکے تہمت بے قراری کی نہ آزردہ ہو یار | میں نے کس دن ہجر میں نالہ کیا فریاد کی

آغا علی خان سے تو کچھ نہ کہا۔ دوسروں کی طرف میر صاحب نے خطاب کرکے کہا۔ آپ کے فرمانے کے مطابق میں نے اس زمین کا خاتمہ کر دیا۔ اور آپ نے تعریف کا خاتمہ کر دیا۔ اب کیا پڑھوں گا۔

رؤسائے شہر اور انیس

شاہزادہ میرزا سلیمان قدر بہادر جو خاندان شاہانِ اودھ کے آخری مقتدر فرد تھے۔ کبھی کبھی اکابرین لکھنؤ سے یا تو خود ملتے تھے۔ یا اُنھیں بلوا لیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میر انیس مرحوم کے پاس ہرکارۂ طلب پہنچا۔ مگر میر صاحب نے عذر پیرانہ سالی کیا۔ نواب مغفور رکاب گنج خود تشریف لائے۔ سڑک پر گاڑی رُکی۔ میر انیس صاحب نے اپنی فنس لگوا دی۔ اور نواب صاحب کی فنس کے ساتھ ساتھ گھر تک تشریف لائے۔ اگرچہ میر صاحب کو اس وضع مہمان نے بہت کمزور پاکر فنس کے ساتھ نہ چلنے کی خواہش کی مگر اس وضع قدیم کے پابند نے نہ مانا۔ اور اپنے حسن اخلاق اور عقیدت کو یوں ظاہر کیا۔ میر صاحب نے کمرہ میں گاؤ تکیہ لگوا دیا تھا۔ نواب مغفور آکر رونق افروز ہوئے۔ میر صاحب نے موافق رسم قدیم ایک اشرفی اور پانچ روپیہ نذر دکھائے۔ اُنھوں نے فقط ہاتھ رکھ دیا جب تک بیٹھے رہے شعر و سخن کے اذکار رہے۔ خود بھی اپنا کلام سُنایا۔ اور میر صاحب سے بھی سُنا۔ جب چلنے لگے تو میر صاحب کا دیوان باصرار اپنے ساتھ لے گئے۔ جو اب تک اُن کے صاحبزادہ شاہزادہ ثریّا قدر بہادر کے پاس موجود ہے۔ اور میر صاحب کو ایک دوشالہ اور دو سو روپیہ بھیجے۔

جنابِ انیس وقت آخر بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ دس جمادی الاول ۱۳۰۲ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ پچانوے برس کی عمر پائی۔ حکیم صفدر حسین صاحب مرحوم نے یہ تاریخ کہی جو قبر پر کندہ ہے۔ اسکنہ اللہ ریاض الجنۃ۔

۱۳۰۲ھ

لطیفہ | میرزا محمد رضا برق اُستاد جلال لکھنوی ایک مقبرہ میں مقیم تھے۔ ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے کہ میر اُنس صاحب کی فنس نکلی۔ کسی وجہ سے میر صاحب میرزا محمد رضا کے یہاں جاتے نہ تھے۔ برق میر صاحب کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بہت جُھک کے سلام کیا۔ آپ کی عادت تھی۔ کہ صاحب سلامت بہت جُھک کے کرتے تھے۔ میر صاحب نے خنس میں سے اُسی طرح آپ کو بھی بہت جُھک کے سلام کیا۔ میرزا صاحب نے کہاروں کو آواز دی۔ ذرا فنس کو روکو۔ اور میر صاحب سے پکار کر کہا۔ یہاں بھی آپ کبھی آیئے گا؟ کہا۔ ہاں آؤں گا تو ضرور مگر ابھی تو جی نہیں چاہتا +

اُنس اور مشاعرے

نقل | شاہی زمانہ میں آغا علی خاں شاگرد میر علی اوسط رشک مرحوم نے ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا۔ تمام شعرائے شہر جمع تھے۔ آغا علی خاں سے اور میر اُنس صاحب سے قدیمی چشمک تھی۔ اس لیے خود تو نہ گئے۔ بلکہ جناب آغا حیدر صاحب نیشاپوری کے وسیلہ سے آپ کو بلوایا۔ میر صاحب جناب تعشق کو ساتھ لے کر پہنچے۔ دیکھا مشاعرہ شاعروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ چوب دار سے دو کرسیاں منگوا کر باہر بیٹھے۔ آغا حیدر صاحب اور میر علی اوسط کو معلوم ہوا کہ میر صاحب آئے ہیں۔ فوراً اُٹھے۔ اور آواز دی "آیئے بھائی صاحب" انھوں نے کہا۔ اندر جگہ نہیں جب میری باری آئے گی چلا آؤں گا۔ مگر انھوں نے نہ مانا اور اندر بلا ہی لیا۔ یہ اندر جا کر بیٹھے۔ جب ان کی باری آئی۔ غیر طرح غزل پڑھی۔ اُس کے بعد طرح میں پڑھی۔ ایک شعر پر آغا علی خاں صاحب نے کہا۔ جناب نے تو اس زمین کا خاتمہ کر دیا۔ گویا یہ فقرہ طنز آمیز تھا۔ میر اُنس نے فوراً جیب میں غزل رکھ لی۔ آغا علی خاں اور دیگر حضرات نے کہا۔ کیوں کیوں فرمایئے فرمایئے

تو مجالِ عذر کہاں سے لاتا۔ ناچار قبول کیا۔ اور دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

سیر چشمی

واقعی میر انیس کو ایسا ہی سیر چشم ہونا چاہیے تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ابتدا سے اُنھوں نے ایسی ایسی سرکاروں میں ملازمت کی تھی۔ جہاں شاہانہ شان و شوکت نظر آتی تھی کیا کام وہ تفویض ہوئے تھے۔ کہ ہر وقت سیکڑوں بلکہ ہزاروں روپیہ ہاتھ سے نکلتے رہتے تھے حرصِ دُنیوی کا ذکر نہیں۔ اگر ایسا شخص بھی سخی نہو تو تعجب ہو۔ علاوہ اوپر کی آمدنی کے جس کی کچھ انتہا نہ تھی۔ خود میر صاحب تنخواہ بھی معقول پاتے تھے یعنی دو سو روپیہ ماہوار اور یہ اُس زمانہ کا ذکر ہو جب ایک روپیہ آج کل کے دس روپیہ کی برابر تھا۔ پھر اس روزانہ کے عنایات مزید۔ چنانچہ جب میر صاحب نے کوشش کر کے نواب ملکہ جہاں بیگم صاحبہ کی تنخواہ کرائی۔ اُس وقت اُنھوں نے بجائے دو سو روپیہ کے چار سو روپیہ تنخواہ کر دی۔ اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ کسی دوسرے موقعہ پر ایک مرتبہ اور پچیس ہزار روپیہ اُسی قدر شناس بیگم نے میر صاحب کو عطا فرمایا تھا۔ تاکہ میر صاحب اولاد کے لیے کوئی جائداد خرید لیں۔ اور وسیلۂ معاش قائم ہو جائے۔ مگر میر صاحب کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ بھلا روپیہ کہاں رُک سکتا تھا۔ جو ملا صرف کیا۔ یہی وجہ تھی کہ نواب ملکہ جہاں کے انتقال کے بعد میر صاحب سیر چشم مفلس رہے +

جب ملکہ جہاں کربلائے معلّیٰ تشریف لے جانے والی تھیں۔ اُن کے ہمراہ تقریباً دو سو آدمی تھے۔ اُن کے علاوہ میر صاحب سے جس نے سفر کربلا کی استدعا کی میر صاحب نے اُس کو بغیر بیگم صاحبہ کو اطلاع دیے اپنے ساتھ لے لیا۔ اور اس طرح ایک کافی تعداد زائرین کی ساتھ لے جا کے ذخیرۂ ثواب حاصل کیا۔

خط کے لیے ہاتھ میں بہت لوچ کی ضرورت ہی۔ دیکھا گیا ہی کہ بہت سے خوش خط حضرات شفیعہ اچھا نہیں لکھتے۔ عام طور سے یہ خط ایرانیوں میں پایا جاتا ہی۔ اکثر پُرانے کتب خانوں میں فارسی کے قلمی نسخے ایک اسی خط میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میری رائے میں یہ حروف شفیعہ خوش خط الفاظ سے زیادہ نظر کو بھلے معلوم ہوتے ہیں +

سخاوت | میر صاحب میں فضیلت سخاوت درجۂ کمال پر تھی۔ جب کسی حاجت مند کو دیکھ لیتے تھے۔ اُس وقت اور کوئی خیال اُن کے دماغ میں راہ نہیں پاتا تھا۔ سوائے اس کے کہ کسی طرح جلد سے جلد اس کی حاجت روائی کی کوئی تدبیر کریں۔ اور بیشتر کامیاب ہی ہوتے تھے۔ جس محلہ میں رہتے تھے وہاں کے غربا کے لیے میر صاحب گویا حاتم ثانی تھے۔ جناب حمید فرماتے تھے کہ نادار اصحاب کی لڑکیوں کے لیے اکثر ایسی ایسی معقول رقمیں میر صاحب نے دی ہیں کہ لوگوں کو تعجب ہو گیا +

واقعہ | ایک مرتبہ کا واقعہ ہی کہ میر صاحب رکاب گنج میں کھڑے تھے۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ شالی رومال کاندھے پر پڑا تھا۔ نیچی چولی کی جامہ وار کی اچکن پہنے تھے جو جدید بنوائی تھی۔ اُن کو امیر صورت شریف وضع پاکر ایک سائل نے سوال کیا۔ میر صاحب نے ایک رقم قلیل جیب سے نکال کر دی۔ اُس نے کہا میں اور زیادہ کا محتاج ہوں۔ میر صاحب نے کہا کہ میرے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ سائل نے کہا۔ کپڑے تو ہیں۔ میر صاحب نہ معلوم اُس وقت کس عالم میں تھے ملازم سے کہا گھر سے لنگی مانگ لے۔ اس نے امتثال امر کیا۔ سب کپڑے اُتار کے فقیر کے حوالہ کیے۔ حالانکہ اُس بے چارے نے لجاجت سے کئی مرتبہ کہا۔ غریب پرور میری یہ غرض نہ تھی۔ مگر جب اُس نے میر صاحب کو جوش سخاوت میں برہم پایا

کئی مرتبہ دربار میں گئے۔ کبھی کبھی رفقاء منزل میں بھی جاتے تھے۔

داغ اور جناب انس

ایک مرتبہ رفقاء منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ فصیح الملک حضرت داغ آئے اور ایک گوشہ میں ٹوپی اُتار کر بیٹھ گئے۔ اس زمانہ میں آپ میں آزادی زیادہ تھی۔ کسی نے میر صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ حضرت آپ سے واقف ہیں۔ جواب دیا۔ نہیں۔ کہا میر اُنس آپ ہی ہیں۔ جلدی سے ٹوپی پہن کر سلام کیا۔ اور اُٹھ کر ملے۔ دوسرے دن قیام گاہ پر آئے۔ ہاتھ میں اپنا دیوان قلمی لیے ہوئے تھے۔ میر صاحب سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چلتے وقت اپنا دیوان دیا۔ اور عرض کیا۔ کہ وقتِ فرصت آپ ملاحظہ فرمایئے گا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ چند غزلیں خود سُناؤں۔ مگر آپ کی تکلیف کا خیال ہوا۔ جناب داغ کے جانے کے بعد میر صاحب نے جناب رشید سے جستہ جستہ مقام سے پڑھوا کر سُنا۔ تیسرے دن جناب داغ کے تغزل کی تعریف کی اور کہا "دہلی عبارت آپ ہی سے ہے" جناب داغ سے اور جناب رشید سے بے تکلفانہ گفتگو اور ان کا اُنھیں۔ اور اُن کا اُنھیں غزلیں سُنانا خالی از لطف نہیں۔

الحاصل ایک روز نواب صاحب بہادر سے وطن چلنے کی اجازت چاہی۔ فرمایا۔ کہاں جایئے گا یہیں رہیے۔ عرض کیا۔ جی تو یہی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ آپ سا باکمال قدرداں رئیس کہاں دستیاب ہوسکتا ہے۔ لیکن بُرا ہو ضعیفی کا کہ اس سعادت سے محروم رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک رومال اور دو شالہ۔ اور چھ سو روپیہ مرحمت فرما کر رخصت کیا۔

میر صاحب خطِ شفیعہ خوب لکھتے تھے۔ یہی خطِ شفیعہ زمانۂ شاہی میں اس قدر مروج تھا (اور واقعی مروج ہونے کے قابل بھی ہے) کہ ہر پڑھا لکھا اُس کی مشق کرتا تھا۔ مگر اُس

آپ کے سمع ہمایوں تک پہنچا۔ بہت مشتاق ہوئے۔ اور چند بار تحریر کے وسیلہ سے طلب فرمایا۔ لیکن میر صاحب اس وقت ضعیف ہو گئے تھے۔ سفر کی صعوبت مدِ نظر رکھ کر پیرانہ سالی کا عذر واقعی کیا۔ آخر کار ۱۲۷۵ھ میں اپنے اُستاد جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی کو لینے کے لیے روانہ فرمایا۔ منشی صاحب لکھنؤ تشریف لائے۔ منشی محمد احمد صاحب صریرؔ خلف امیر مینائی بھی ہمراہ تھے۔ میر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ منشی صاحب نے کہا میں آپ کے لینے کے لیے آیا ہوں۔ میر صاحب نے کہا۔ دیکھیے میری یہ حالت ہے۔ منشی صاحب نے کہا۔ ظاہر ہے کہ عالمِ پیری ہے۔ لیکن آپ کو چلنا ضرور ہوگا۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ بہ راحت و آرام پہنچیں گے۔ غرض کہ میر صاحب نے منظور کیا اور خود مع جنابِ رشیدؔ و جنابِ سعیدؔ کے روانہ ہوئے۔

اس زمانہ میں رامپور میں ریل نہ تھی۔ مراد آباد آئے۔ اور وہاں سے رامپور پہنچے۔ دربار میں شرفِ ملازمت حاصل ہوا۔ جلالؔ۔ امیرؔ۔ داغؔ۔ تجلیؔ وغیرہم موجود تھے۔ ایک عرصہ تک شعر و شاعری کا ذکر رہا۔ سلسلۂ سخن تاریخ پر پہنچا۔ جنت آشیانی ٹیپو سلطان کی تاریخ بیان فرمانے لگے۔ اور بہت دیر تک بیان فرماتے رہے۔ ایک مقام پر پہنچ کر خاموش ہو گئے۔ اور میر صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ اس کے آگے اگر آپ کو یاد ہو تو بیان کیجیے۔ میر صاحب نے عرض کی بہت خوب۔ اور وہیں سے بیان شروع کر دیا اور ایک عرصہ تک بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد عرض کی کہ حضور کی سمع خراشی کا خیال ہے۔ حکم ہو تو اور عرض کروں۔ مسکرا کر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ آپ کو تاریخ میں بھی دخل ہے +

ایک غزل میر صاحب کی سُنی۔ اور ایک غزل اپنی سُنائی۔ آٹھ روز تک وہاں قیام ہوا۔

خدمت میں آئے۔ اور سامنے لاکر رکھ دیے۔ بیگم صاحبہ نے دریافت فرمایا۔ یہ روپیہ کیسے ہیں۔ میر صاحب نے عرض کی۔ آپ کی تنخواہ ہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا کیسی تنخواہ۔ میر صاحب نے اول سے آخر تک سارا قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحبہ ان کی اس کوشش پر بہت ہی خوش ہوئیں اور اُس روز سے اُن کو بھائی کہنے لگیں۔ اور چاہا۔ کہ اس کا صلہ خاطرخواہ دوں لیکن میر صاحب نے انکار کیا۔ اور عرض کی۔ اس کا صلہ میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ آپ تمام بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کے لیے تشریف لے چلیے۔ اور مجھے بھی ساتھ لیجیے۔ بیگم صاحبہ راضی ہوگئیں۔ سامانِ سفر درست ہوگیا۔ اور اس نتیجہ خیز سفر کی تاریخ بھی معین ہوگئی۔

چونکہ میر صاحب قبلہ ملکۂ جہاں کے ہمراہ جا رہے تھے۔ لہذا یہاں کے تمام انتظام کے لیے ایک اور داروغہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے لیے میر صاحب کے صاحبزادہ۔ جناب صابر تجویز ہوئے۔ اور پچاس روپیہ ماہوار کی تنخواہ کی گئی۔ اور تمام کنجیاں اُن کے حوالہ کی گئیں۔ اور نقد و جنس و جواہرات اور تمام اثاثہ کی دو فہرستیں تیار ہوئیں۔ ایک جناب صابر کو دی گئی۔ اور دوسری نواب ملکہ جہاں کے پاس رہی۔ تحویل میں نقد روپیہ بارہ لاکھ تھا۔ غرض کہ یہ سب انتظام ہوکر بیگم صاحبہ حج اور زیارت عتبات عالیات کو روانہ ہوگئیں۔ اور سات برس تک اس مبارک سفر میں رہیں۔ نواب ملکۂ جہاں کی اس سات برس کی عدم موجودگی میں لکھنؤ میں بعض واقعات جو گذرے ہیں۔ وہ جناب صابر کے حالات میں لکھے جائیں گے +

جناب اُنس کی ملازمت

جنت آشیاں نواب کلب علی خاں صاحب بہادر جیسے علم دوست اور قدردان اہلِ علم تھے سب کو معلوم ہے۔ کیسے کیسے باکمال۔ فاضل۔ عالم۔ شاعر۔ بلکہ ہر فن کے جاننے والے۔ آپ کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ میر صاحب کے علم و کمال کا شہرہ

اور کھوئے ہوئے نوٹ کے مل جانے پر بہت تعجب کیا۔ اس حُسنِ سعی کی وجہ سے اُن کے دل میں بہت جگہ ہوگئی۔ اور اُن کی بہت رعایت کرنے لگیں۔ بلکہ مثل عزیزوں کے سمجھنے لگیں +

نواب ملکۂ جہاں کی تنخواہ ہوگئی

دوسرا کارِ نمایاں میر صاحب سے ایسا ہوا۔ جس کی وجہ سے نواب ملکۂ جہاں اُن کو بھائی کہنے لگیں۔ اُنھیں چیف کمشنر صاحب کے پاس یہ کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ ایک روز صاحب نے کہا "آپ ہمارا اُستاد ہی۔ اگر کوئی کام ہو تو فوڑا ہم سے کہیے ہم اُسے ضرور کر دے گا"۔ انھوں نے کہا۔ ہمیں آپ سے یہی اُمید ہی۔ میرا تو اس وقت کوئی کام نہیں۔ البتّہ میں جن کا ملازم ہوں۔ اُن کا کام ہی۔ اگر آپ اُسے انجام دے دیں تو میں نہایت ممنون ہونگا۔ صاحب نے کہا وہ کیا ؟ میر صاحب نے کہا۔ آپ کو معلوم ہی میں نواب ملکۂ جہاں کا داروغہ ہوں۔ اور وہ بی بی محمد علی شاہ کی ہیں۔ افسوس ہی کہ سرکارِ کمپنی نے اُن کی طرف توجہ نہ کی۔ اور ایسی جلیل القدر بیگم کی کچھ تنخواہ نہ ہوئی۔ صاحب نے کہا۔ اچھا۔ ہم کوشش کرے گا۔ میر صاحب وقتاً فوقتاً وہ محبت نامے جو محمد علی شاہ نواب ملکۂ جہاں کو لکھتے تھے۔ اور یہ اُن کو لکھتی تھیں۔ اور دوسرے کاغذات شاہی تلاش کر کے نکالتے اور چیف کمشنر صاحب کو دکھلاتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان پر نواب ملکۂ جہاں کا مرتبہ ظاہر ہو گیا۔ اور آخر کار اُنھوں نے ایسی رپورٹ کر دی۔ کہ کئی ماہ کے بعد ساڑھے چار ہزار کی پنشن کا حکم آگیا۔ صاحب نے یہ حکم میر صاحب کو سُنایا۔ میر صاحب کی اُس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ الغرض میر صاحب اپنی سعی میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ سارا قصّہ نواب ملکۂ جہاں سے بیان نہ کیا۔ جب مہینہ ختم ہوا تنخواہ جا کر وصول کی۔ اور اُسے لیے ہوئے بیگم صاحبہ کی

اُن کے پاس گیا۔ اُنھوں نے پانچ سو دے کر اُس سے لے لیے۔ یہ خبر میر صاحب کو بھی کسی ذریعہ سے معلوم ہوئی۔ میر صاحب اُن کے پاس گئے۔ اور دریافت کیا۔ اُنھوں نے کہا۔ ہاں میں نے یہ مقدار دے کر لے لیے ہیں۔ میر صاحب نے کہا۔ وہ نوٹ ملکہ جہاں کے ہیں۔ آپ اُنھیں دے دیں۔ اور جو رقم آپ نے دی ہی وہ مجھ سے لے لیں۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ میں اس رقم پر نہ دونگا۔ بلکہ اس مثل کے موافق۔ کہ "جاتا دھن دیکھیے تو آدھا دیجیے بانٹ" چھ لاکھ روپیہ لونگا۔ غرض کہ میر صاحب دس ہزار تک دیتے رہے مگر یہ معاملہ طے نہ ہوا +

نوٹ مل گئے

شاہی زمانہ میں میر صاحب نے ایک انگریز کو پڑھایا تھا۔ اب اُس وقت میں وہ چیف کمشنر ہو کر آئے۔ یہ جو اِن کو معلوم ہوا۔ یہ ملنے گئے۔ صاحب اپنے اُستاد کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ نہایت احترام سے بٹھایا۔ اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اثنائے کلام میں میر صاحب نے نوٹ والا قصہ بھی بیان کیا۔ چیف کمشنر نے کہا۔ "کل ہم اُن کو بلوا کر دلوا دے گا۔" دوسرے روز ابوتراب خاں صاحب کے یہاں چپراسی پہنچا۔ اور جا کر کہا۔ چیف کمشنر صاحب نے آپ کو بلایا ہی۔ یہ سُن کر وہ گھبرا گئے اور ایک کھلابلی مچ گئی۔ اور سبب اس کھلبلی مچ جانے کا یہ تھا۔ کہ اُس وقت جس پر باغی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اُس کو سزائے موت یا اور دوسری سزائیں دی جاتی تھیں۔ غرض کہ ابوتراب خاں صاحب گئے۔ صاحب نے نوٹ میر صاحب قبلہ کو دلوا دئے۔ اور پانچ سو روپیہ میر صاحب نے ابوتراب خاں صاحب کو دے دیے۔ داروغہ صاحب خوش خوش نوٹ لے کر آئے۔ اور نواب ملکہ جہاں کے سامنے پیش کر دیے۔ وہ مغفور میر صاحب کی اس کارگذاری پر بہت خوش ہوئیں

اس پر بھی میر صاحب نے انکار ہی فرمایا۔ لیکن اُنھوں نے اصرار کو اس حد پر پہنچایا
کہ اُن کو لیتے ہی بن پڑی۔ میر صاحب نے کپڑوں کا انتظام کیا۔ اور تاریخ معینہ پر
ڈیوڑھی پہ حاضر ہوے۔ محل دار نے جا کر دست بستہ بیگم صاحب سے عرض کی۔ حضور
وہ میر صاحب حاضر ہیں۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا۔ کون۔ محل دار نے کہا۔ حضور نام تو مجھے
یاد نہیں رہا۔ بھلا سا بتایا تھا۔ وہی میر صاحب۔ جن کے بارے میں منور الدولہ بہادر نے
لکھا تھا۔ فرمایا۔ ہاں۔ ہاں۔ انھیں جا کر بٹھاؤ۔ پھر پردہ کرا کے اندر بلایا۔ اور بعد بات چیت کے
ایک سو روپیہ ماہوار کی تنخواہ مقرر کی۔ اور اُس وقت ایک ہزار روپیہ اور ایک خلعت
مرحمت فرمایا۔ میر صاحب اپنے فرضِ منصبی کو انجام دینے لگے۔

پرامیسری نوٹ کھو گئے

ایک روز ملکۂ جہاں نے فرمایا۔" داروغہ صاحب ہمارے پاس بارہ لاکھ کے
پرامیسری نوٹ تھے۔ صندوقچہ میں رکھے تھے۔ اُسی کم بخت لوٹ میں غائب ہو گئے
کسی طرح اُن کا پتہ لگاؤ۔ شاید دستیاب ہو جائیں۔" میر صاحب نے عرض کی "بہت
خوب۔ خیال رکھوں گا۔ لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں۔ اُن کا ملنا دشوار ہے۔"
صاحب تاریخ اودھ لکھتے ہیں۔ بعد غدر نوٹوں کی اس قدر بے قیمتی ناسی ہوئی تھی۔
کہ بیان سے باہر ہے۔ اونے اونے آدمیوں کے پاس ہزاروں کے نوٹ دکھائی دیتے
تھے۔ مگر سرکار نے ممانعت کر دی تھی۔ کہ کوئی نوٹ نہ خریدے۔ اُس پر بھی ہزار کا نوٹ
دس روپیہ کو فروخت ہو گیا۔ اور لوگ مالا مال ہو گئے۔ چونکہ ممانعت خرید ہو چکی تھی۔
لہٰذا ملکۂ جہاں کے نوٹ بک نہ سکے تھے۔ عجب اتفاق پیش آیا۔ یا یہ کہیے کہ اُس کی
قسمت جاگی۔ وہ صندوقچہ ایک سکھ لے گیا تھا۔ اُس میں جو کچھ نقد تھا وہ تو اُس نے لے لیا
مگر نوٹ اُس کے مطلب کے نہ تھے۔ اُن کو لے کر ابو تراب خاں صاحب۔ جن کا کڑہ مشہور ہے

تم ہمیشہ سے ہمارے یہاں کے خیر خواہ رہے ہو اور اُمید ہی کہ اب بھی تمہارا وہی خیال ہوگا۔ ہم کو ایک لائق اور متدین اور منتظم داروغہ کی ضرورت ہی۔ اگر تمہارے علم میں کوئی ایسا شخص ہو تو ہمارے پاس بھیج دو۔ اس تحریر کے دیکھتے ہی منور الدولہ کے ذہن میں جناب اُنس ہی آئے۔ آدمی بھیج کر اُن کو بلوایا اور وہ تحریر دکھا کر کہا کہ میں نے آپ کو تجویز کیا ہی۔ اور اسی وجہ سے آپ کو بلایا ہی۔ اُنھوں نے انکار کیا۔ اور کہا عورت کی ملازمت میں ناپسند کرتا ہوں۔ قصّہ کوتاہ منور الدولہ بہادر نے اتنا اصرار کیا کہ میر صاحب کو مجبوراً منظور ہی کرنا پڑا۔ منور الدولہ بہادر نے نواب ملکہ جہاں کو جواب میں لکھ دیا۔ کہ میں نے موافق آپ کی منشا کے ایک صاحب کو تجویز کر دیا ہی۔ اور وہ فلاں روز حاضر ہونگے میر صاحب قبلہ اس قدر مفلس تھے۔ کہ لباس کا انتظام بھی جیسا کہ چاہیے نہ تھا۔ اور اس فکر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ کہاں سے لباس کا انتظام کروں۔ کہ اتنے میں بر جیس قدر بہادر کے اُستاد مولوی شیخ احمد حسین صاحب جو میر صاحب کے شاگرد تھے آئے اور متردد دیکھ کر عرض کیا کہ آج کچھ میں آپ کو متفکر پاتا ہوں۔ فرمایا کچھ نہیں۔ اُنھوں نے فرمایا میں نہ مانوں گا۔ کوئی نہ کوئی فکر تو ضرور ہی۔ میر صاحب قبلہ نے سارا قصّہ بیان کر دیا۔ وہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ اور بعد اس کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آئے۔ اور میر صاحب کی خدمت میں ایک رومال جس میں چالیس اشرفیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پیش کیا۔ میر صاحب کو اپنی تمام عمر میں ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا مارے شرم کے پسینے پسینے ہو گئے۔ گردن جھکا کر صاف انکار کر دیا۔ اُنھوں نے عرض کیا۔ آپ کچھ اور خیال نہ فرمائیے۔ یہ میں آپ کو قرض دیتا ہوں۔ جس وقت آپ کے پاس ہو۔ آپ مجھے دے دیجیے گا۔ میں بقسم کہتا ہوں۔ کہ لے لوں گا۔

اپنے والد ماجد کے اُس وسیع دسترخوان پر جہاں روزانہ کھانا کھاتے تھے نہ حاضر ہوئے باپ نے بھی نہ بلوایا۔ رفتہ رفتہ یہ بات سب کو معلوم ہو گئی۔ تا اینکہ معزز مصاحبوں نے امجد علی خاں صاحب بہادر کو سمجھایا۔ اور یہ دسترخوان پر حاضر ہوئے۔ منورالدولہ بہادر نے فرمایا۔ تم کئی روز سے کہاں تھے کہ کھانے میں شریک نہ ہوئے۔ عرض کیا۔ کچھ طبیعت اچھی نہ تھی۔ فرمایا۔ یہ تو بہانہ ہی۔ ہم کو جو سبب ہی وہ معلوم ہی۔ اگر تم زندگی بھر کھانے میں نہ شریک ہوتے تو میں بھی زندگی بھر نہ بلواتا۔ یاد رکھو! اُنس اور منورالدولہ ایک روح اور دو قالب ہیں۔ جناب اُنس کو بھی منورالدولہ سمجھو۔ اور اگر یہ نہ سمجھو تو چچا تو ضرور ہی سمجھو۔ فرماں بردار بیٹے نے گردن جھکا لی +

لکھنؤ اور سنہ ۵۷ء کا غدر

اس سے قبل تحریر ہو چکا ہی کہ جناب اُنس کا اسم مجرائیوں میں تھا۔ جب انقلاب سلطنت ہوا۔ اور واجد علی شاہ کلکتہ بھیج دیئے گئے تو وہ جاتا رہا۔ ۵۷ء کے غدر میں سب ہی کو بھاگنا پڑا۔ سرکار کمپنی کے حکم سے سارا شہر خالی کرایا گیا۔ ان کا خاندان بھی کہیں چلا گیا۔ گوروں، بھوتیوں نے تمام شہر کا نقد و جنس لوٹ لیا۔ ان کا بھی مال و اسباب غارت ہو گیا۔ امن و امان ہو جانے پر سب آکر آباد ہوئے۔ ان کا خاندان بھی آیا۔ چونکہ مال و متاع لُٹ گیا تھا۔ اور کوئی ملازمت کا سلسلہ بھی نہ تھا۔ اس وجہ سے تکلیف میں بسر ہونے لگی۔ اور ایک عرصہ تک یہی کیفیت رہی۔ اور ان مصائب نے اُنس کے جوہر قناعت پر اور جلا کی۔ لیکن بمفاد اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اُن ساعتوں کے آثار بھی ظاہر ہونے لگے۔ جو آئندہ ایک زمانہ تک اُنس کو ایک فردِ فارغ البال کا لقب عطا کرنے والی تھیں +

اُنس برسرِ کار ہوتے ہیں

جب نواب ملکہ جہاں جو محمد علی شاہ کی بی بی تھیں لکھنؤ آئیں۔ تو اُن کو ایک داروغہ کی ضرورت ہوئی۔ ایک تحریر منورالدولہ بہادر کے پاس اس مضمون کی بھیجی۔

ملازموں کو حکم دیا کہ سامان درست ہو۔ جب تیار ہوگیا۔ آدمی کو حکم دیا کہ جناب اُنس
کی خدمت میں جاؤ اور ہماری طرف سے کہو کہ سامان شکار تیار ہے۔ صرف آپ کی دیر ہے
آدمی روانہ ہوا اور جناب اُنس کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔ یہ فوراً اُٹھے اور اپنا سامان
درست کرنے لگے۔ جب جناب اُنس کے آنے میں دیر ہوئی تو منورالدولہ نے ہاتھی
منگوایا اور اُس پہ سوار ہوئے۔ اور برابر اپنے صاحبزادہ امجد علی خاں بہادر کو بٹھایا۔
اور یہ حکم دے کر کہ جناب اُنس تھوڑی دیر میں تشریف لانے والے ہیں۔ اُن کو
فلاں سواری پر روانہ کر دینا۔ اور شکارگاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ دو ہی قدم فیل
کوہ پیکر نے جنبش کی تھی کہ فنس جناب اُنس کی نمودار ہوئی۔ عرض کیا گیا کہ میر صاحب قبلہ
تشریف لا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے وہ سامنے فنس آ رہی ہے۔ فیلبان کو حکم دیا گیا
ہاتھی روکے۔ اُس نے روک لیا۔ اتنے میں میر صاحب کی فنس بھی آ پہنچی۔ کہاروں
نے (بول مہرا) کہہ کر فنس کاندھوں سے اُتار کر زمین پر رکھی۔ میر صاحب باہر تشریف
لائے۔ سلام کیا۔ جواب سلام دینے کے بعد فرمایا کہ معاف کیجیے گا۔ آپ کو کسی قدر
دیر ہوئی۔ اور یہاں آتشِ شوق اس قدر بھڑکی۔ کہ بغیر آپ کے روانہ ہونے پر مجبور ہوگیا۔
یہ فرما کر ہاتھی کو بٹھانے کا حکم دیا۔ جب وہ بیٹھا تو اپنے صاحبزادہ سے فرمایا کہ تم دوسری
سواری پر آؤ۔ اور میر صاحب سے کہا آیئے۔ ہر چند میر صاحب نے کہا آپ صاحبزادہ کو
کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ میں دوسری سواری پر آ جاؤں گا۔ لیکن منورالدولہ بہادر نے
نہ مانا۔ اور کہا۔ ارے بھئی آؤ ہم تم باتیں کرتے چلیں گے۔ راستہ خوب کٹے گا۔ اور میر صاحب کو
اپنے ساتھ بٹھایا۔ اور روانہ ہوگئے۔ امجد علی خاں بہادر کو بمقتضائے سن یہ امر ناگوار ہوا۔ اور
اتنا کہ شکار پر تشریف بھی نہ لے گئے۔ بلکہ اپنے دولت خانہ پر واپس آ گئے۔ اور کئی روز تک

ہم رکاب تھے پوچھا۔ یہ کون شخص ہی۔ اُنھوں نے عرض کیا۔ کہ یہ وہی گدائے متکبر ہی جس کا ذکر اکثر حضور میں آچکا ہی۔ اور شاید اس وقت بھی فاقہ سے ہوگا۔ سعادت علیخاں نے ہواخوری سے واپس آکے ایک ہزار روپیہ اور خلعت میر صاحب کو بھیجا جسے اُنھوں نے بہزار دقّت منظور کیا۔" (ماخوذ از آبِ حیات)

عرشؔ کی نظرِ استغنا پیوند زدہ انگرکھے کو قبائے زربفت سے بہتر سمجھتی تھی۔ آخر میر ہی کے تو بیٹے تھے۔ ذیل کے دو شعر رشید مرحوم کی زبانی سنے گئے تھے۔ دیوانِ عرشؔ میں موجود نہیں۔

یوسف وہ ہوں کہ چھوڑ گیا کارواں مجھے
مُدّت ہوئی نہیں خبرِ رفتگاں مجھے

لے جائے گی یہ وحشتِ دل اب کہاں مجھے
بے یار گور میں بھی نہیں ایک جا قرار

اب میں پھر اُنسؔ کے حالات کی طرف آتا ہوں۔ اور اُن کے واقعاتِ عمر مجملاً بیان کرتا ہوں۔

اُنسؔ اور معاش

زمانۂ شاہی میں آپ کا اسم مجرائیوں میں تھا۔ اور سو روپیہ تنخواہ شادا دودھ کی سرکار سے ملتے تھے۔ لیکن اُن کو کبھی دربار میں مثل اپنے والد کے رسوخ حاصل نہ ہوا اور سبب اس امر کا وہی آغا میر کی چشمک تھی۔ منورالدولہ بہادر سے اور ان سے نہایت تپاک تھا۔ ممکن ہی ان دونوں صاحبوں کی دوستی کے کچھ اسباب ہوں۔ لیکن ہم کو جو کچھ معلوم ہی وہ یہ ہی کہ جناب اُنسؔ کو فنِ تیر اندازی میں ید طولےٰ حاصل تھا۔ گویا کبھی تیر خطا ہی نہ کرتا تھا۔ منورالدولہ بہادر کو بھی تیر لگانے کا بہت شوق تھا۔ اکثر شکار میں ان دونوں صاحبوں کا ساتھ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کو ان سے بہت اُنس تھا۔ منورالدولہ بہادر کی محبت کا اندازہ اس حکایت سے ہوتا ہی۔

واقعہ

ایک مرتبہ منورالدولہ بہادر نے شکار پر تشریف لے جانے کا ارادہ کیا۔

زندگی ایک روش پر بسر کرنا پسند کرتے تھے۔ اگر موجودہ طرزِ تمدن کی طرف نظر ڈالو تو اُس کے آگے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔

حلیہ | میر کلو عرش کی رنگت سانولی کشیدہ قامت تھے۔ اوسط کا جسم تھا۔ سر پر پٹے تھے اونچی چولی کا انگرکھا اور کلی دار پائجامہ استعمال کرتے تھے۔ گھیتلا جوتا۔ یا بوٹ پہنتے تھے۔ آخر عمر میں بسبب پیرانہ سالی کمر خم ہوگئی تھی۔ اور افیون بھی کھانے لگے تھے۔ ہر وقت آنکھیں بند رہتی تھیں حقہ سامنے لگا رہتا تھا۔ جناب رشید جناب حمید اکثر اُن سے مہذب مذاق کرلیا کرتے تھے۔ مثلاً اُن کے سامنے حقہ سے چلم اُتار کے دوسرے حقہ پر رکھدی اور غائب ہوگئے۔ اُنھوں نے تھوڑے سے مراقبہ کے بعد جب کش لیا تو احساس ہوا کہ بغیر چلم کا حقہ بول رہا ہے۔ اب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ چلم ندارد ہے۔ صرف یہ کہہ کے اکتفا کی "یہ لڑکے بڑے شریر ہیں" وضع داری کی اس قدر پابندی کی کہ انتقال بھی یہیں ہوا اور دفن بھی یہیں ہوئے۔ میر محمد جان صاحب شاد انھیں سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

ایک صاحب شاد مرحوم کی زبانی ناقل ہیں۔ کہ میر کلو عرش نے وضع بزرگانہ اختیار کرلیا تھا۔ کہ پانچ بجے قریب شام تحسین کی مسجد کے چبوترہ پر بیٹھا کرتے تھے۔ اور چار چھ شعرائے نامی ہوتے تھے۔ بڑے نازک مزاج تھے۔ کسی رئیس کی طرف نظر اُٹھا کے نہ دیکھتے تھے "یہ وہی تحسین کی مسجد ہے جہاں میر کلو عرش کا نازک مزاج باپ میر تقی میر فاقہ مستی کی حالت میں ایک دفعہ بیٹھا ہوا تھا کہ سعادت علی خاں بہادر کی سواری سامنے سے نمودار ہوئی "نگاہ روبرو" کی صدائیں بلند ہوکر بڑے بڑے رؤسا کا سر تسلیم خم کرتی جاتی تھیں۔ مگر اس بادشاہِ سخن پر شوکتِ شاہی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا حتّیٰ کہ سلام تک نہیں کیا۔ سعادت علی خاں بہادر کو نہایت ناگوار ہوا۔ اور انشا سے جو اُس وقت

بھرا ہوا ہی۔ فرمایا ہاں۔ پھر آدمی کو پکارا۔ صلابت! صلابت! وہ آیا تو اُس سے کہا پٹرا لاؤ۔ وہ ایک لمبا سا پٹرا لایا وہ رکھا گیا۔ اور میں اُس کے ذریعہ سے چوکی پر پہنچا۔
اب شیخ صاحب نے فرمایا "اُنس تم سمجھے یہ میں نے کیا کیا ہی" میں نے عرض کیا "جی نہیں" فرمایا "آتے تو چوک کی سیر کو ہیں جب وہاں سے جی بھر گیا تو کہتے ہیں چلیے ناسخ کے شعر سنیں۔ نہ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے ہیں کمبخت دماغ پریشان کرتے ہیں۔ یہ ترکیب میں نے اُنھیں لوگوں کے لیے کی ہی۔ اب کیونکر میرے پاس آئیں گے۔ بلکہ گو پٹرا ہٹوا دیا۔

جناب اُنس نے یہ نقل بیان کی۔ لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ مارے ہنسی کے لوٹے جاتے تھے۔

چونکہ اس صحبت کے سلسلہ میں میر کلّو عرش کا ذکر بھی آگیا ہی۔ لہذا اُن کا بھی مختصراً ذکر کر دینا فرض سمجھتا ہوں۔ کسی تذکرہ نویس نے میر کلّو عرش کے مدفن کا نشان نہیں دیا ہی۔ یہ امر اتفاقی ہی کہ رشید نے اس صحبت کے سلسلہ میں اُن کی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کہ عرش کی قبر اس امام باڑہ کے صحن میں ہی۔

میر کلّو عرش

میر کلّو عرش۔ خلف ناخدائے سخن میر مرحوم۔ گو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ مگر اُن کی خوش گوئی زبان زد عوام تھی۔ جناب اُنس سے قدیمانہ مراسم تھے۔ اور کوئی ذاتی آمدنی نہ تھی اس وجہ سے میر صاحب ہی کے پاس رہتے تھے۔ میر اُنس صاحب کی وضع داری اور فراخ دلی نے عرش مغفور کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ میر کلّو عرش ایسا سخن گو لکھنؤ ایسے شہر میں کسی دوسری جگہ رہ کر بھی اپنی زندگی عزت سے گذار سکتا تھا ہاں یہ لطفِ شعر گوئی اور صحبت اہل علم اُن کو اور کسی جگہ میسّر نہیں ہو سکتی تھی۔ پرانے لوگ تھے

اتوار کی صحبت

میر صاحب کے یہاں ہر اتوار کو ایک صحبت ہوا کرتی تھی۔ شہر کے اکثر نامی شعرا و رؤسا اور اہلِ استعداد آیا کرتے تھے۔ مثلاً قلق۔ بحر۔ امیر۔ میر کلو عرش۔ مخدومی جناب صفی صاحب کے والد ماجد۔ مولانا فضلِ علی صاحب مرحوم۔ تعشق۔ عشق۔ صابر۔ اچھے صاحب عیش ان لوگوں سے تو گویا اتوار ناغہ ہی نہ ہوتا تھا۔ حکیم شفاء الدولہ مرحوم کے بھائی میاں فلک مرحوم صرف شرکتِ صحبت کی غرض سے لکھنؤ اکثر آیا کرتے تھے (اللہ اکبر ایک وہ زمانہ تھا۔ اور ایک ہمارا زمانہ ہے کہ شعر و سخن کے تذکرے گویا کہ اُس وقت کے مقابلہ میں بالکل نہیں ہوتے) چاء بسکٹ۔ شامی کباب۔ روغنی روٹیاں۔ تواضع میں پیشکش کی جاتی تھیں۔

اس صحبت میں ہر قسم کے ذکر اذکار ہوتے تھے۔ کبھی شاہی زمانہ کے قصے چھڑ گئے کبھی شاعری پر بحث ہونے لگی۔ کبھی لغوی تحقیقات ہونے لگی۔ اور کبھی شعر خوانی۔

جناب رشید و حمید فرماتے تھے۔ کہ دادا صاحب (جناب اُنس) شیخ ناسخ کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ اور عجیب عجیب و دلچسپ حکایات بیان کرتے تھے۔ مثلاً۔

نقل

ایک مرتبہ شیخ صاحب کی خدمت میں غزل لے کر ٹکسال والے مکان میں حاضر ہوا۔ جیسے ہی دروازہ میں قدم رکھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ موری بند کرادی ہے تمام انگنائی میں پانی بھرا ہوا ہے۔ اور بیچ صحن میں خود بدولت چوکی بچھائے بیٹھے ہیں مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن اُن کے خوف سے فوراً ضبط کیا۔ جب میری طرف دیکھا میں نے سلام کیا۔ کہا آؤ۔ ہنسی کا اس فرمانے پر قریب تھا کہ میں بے اختیار ہنس پڑوں۔ لیکن بمشکل میں نے ضبط کر کے عرض کیا۔ کہ حضور کیونکر آؤں۔ چاروں طرف تو پانی

اُس کے برابر ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا وہ بھی خریدا۔ اس میں متعدد چھوٹے چھوٹے مکان لے کر ملائے جواب تک "میر عشق کی بغیہ" کے نام سے موسوم ہی۔ مگر میر صاحب کے زمانہ میں "باغِ اُنس" کہلاتا تھا +

میر صاحب نے چاہا تھا کہ اس باغ کے متصل ایک امام باڑہ بنائیں۔ لیکن ایک پھاٹک اور اُس کے اِدھر اُدھر دو کمرے بن کر رہ گیے۔ جو اب تک موجود ہیں۔ اس امام باڑہ کے مقدس تہ خانہ میں سبزہ زار نظم کے چند جادو بیان بُلبل خوابِ گراں میں مصروف ہیں اب وہ وقت ہی کہ خود اُنھیں کے ہاتھوں کے پرورش یافتہ درختوں کے پھول نسیمِ سحر کو اپنی مہک سے عطر بیز کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ کبھی پھر ہماری طرف توجہ کریں۔ مگر وہ سرد جھونکے اُن کے خواب کی مدت اور طولانی کرتے ہوئے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے واپس آتے ہیں

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ گورستاں یہ ویرانی　　　تمھیں اے سونے والو کس طرح آرام آتا ہی

یہاں اُنس، صابر، تعشق، عاشق، جدید کی قبریں ہیں۔ (میر عشق کی قبر اِس میں نہیں ہی بلکہ اُس مکان میں ہی جہاں رشید مرحوم رہتے تھے۔ وہ مکان بھی باغ سے متصل ہی +

اُنس اور شاعری — اُن کی غزل خوانی کا بہت شہرہ تھا۔ سراج الدولہ۔ اسیر وغیرہم کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ اور مشاعرے کو اپنا ثنا خواں بنا کے اُٹھتے تھے۔ آخر وقت میں جب نواب مہدی حسن خاں۔ عرف آغا ابو صاحب سی۔ آئی۔ ای متولی حسین آباد مبارک کا شباب تھا۔ تو اُن کو بھی بمقتضائے عمر شعر گوئی کا شوق ہوا۔ کئی دفعہ خود اُنس مغفور کے پاس آئے۔ اور اپنے مشاعرے کی شرکت کی استدعا کی۔ میر صاحب نے پیرانہ سالی کا عُذر کیا۔ مگر آغا صاحب اس قدر حسنِ عقیدت رکھتے تھے کہ نہ مانا۔ مجبوراً میر صاحب چند مشاعروں میں شریک ہوئے +

سیّد محمد میرزا صاحب اُنسؔ

سیّد ذوالفقار علی کے پوتے۔ اور جناب رشیدؔ کے دادا تھے۔ ان کا تخلص (اُنسؔ) تھا۔ حضرتِ ناسخؔ مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس خاندان میں انھیں سے شاعری کی ابتدا ہوتی ہی۔ تعجب یہ ہی کہ تذکرۂ آبِ حیات میں آزاد مرحوم نے شیخ ناسخؔ کے نامی شاگردوں کی فہرست میں ان کا نام نہیں لکھا۔ ظاہرا وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ اُن کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ دوسرے آزاد مرحوم نے شاگردان ناسخؔ کے لیے زیادہ کاوش بھی نہیں کی ہی۔ البتہ عبدالغفور خاں شہبازؔ نے اپنے تذکرہ میں سلسلۂ ناسخؔ میں اُنسؔ کا ذکر کیا ہی۔

جنابِ اُنسؔ ذی علم بزرگ تھے۔ عربی کے تمام درسیات نکلے ہوئے تھے۔ اور فارسی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر بھی اچھا کہتے تھے۔ دیوان قلمی اس وقت تک خاندان رشیدؔ میں موجود ہی۔ جنابِ رشیدؔ سے جب کہا گیا "دو دیوان طبع کرا دیجیے"۔ فرمایا "اُن کی وصیت تھی کہ چھپوانا نہیں"

حلیہ و لباس گورا رنگ تھا۔ نہایت خوب صورت تھے۔ جوانی میں ورزش کا بہت شوق تھا۔ کیادہ (جو مثل کمان کے ہوتا ہی) کھینچتے تھے۔ اونچی چولی کا انگرکھا پہنتے تھے۔ اور جس وقت دربار میں جاتے تھے تو چپکن استعمال کرتے تھے۔ کرتہ بہت نیچا ہوتا تھا۔ کبھی مشروع کا پاجامہ پہنتے تھے۔ اور کبھی سادہ۔ ٹوپی پنجگوشیہ قالب دار۔ جوتہ گھیتلا وہی ایک اشرفی کا۔ مگر کبھی کبھی بوٹ بھی +

پُرانی سکونت شاہی زمانہ میں بہت سے محلوں میں رہے۔ مثلاً مشک گنج، رشیدیوں والا احاطہ غدر کے بعد حسن خاں خواص واجد علی شاہ کا مکان ایک ہزار ایک سو روپیہ کو خرید کیا

سیّد علی میرزا

یہ ذوالفقار علی میرزا کے فرزند تھے۔ شاہِ اودھ (غازی الدین حیدر) کے زمانہ میں کارسفارت انجام دیتے تھے۔ بنارس میں ان کا زیادہ قیام رہتا تھا۔ نہایت خوب صورت اور وجیہہ تھے۔ کہا جاتا ہی کہ جب بنارس میں نکلتے تھے۔ تو لوگ اُن کی صورت دیکھکر درود پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں جس قدر منڈیاں تھیں۔ اُن کی تحصیل وصول بھی انھیں کے متعلق تھی۔ معتمدالدولہ آغامیر مشہور وزیرِاودھ ان کے چچازاد بھائی تھے۔ بھائیوں میں چشمک رہتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آغامیر کو عروجِ تام حاصل ہوا۔ ان کی تنخواہ بند کرادی۔ شاہ مینا صاحب کے وہاں ایک محلہ میں رہتے تھے۔ تخمیناً ستّر برس کی عمر ہوئی۔ اور غالباً حسن رضا خاں کے امام باڑہ میں مدفون ہیں۔

سیّد صاحب کے دو بیٹے تھے۔ سید محمد میرزا اُنس۔ سید محمد رضا قدس۔ علی میرزا صاحب مغفور کو خطِ نسخ میں یدِطولےٰ حاصل تھا۔ اور اُس وقت کے بہتر نسخ لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ پورا سورۂ یٰسیں لکھ کر حضورِ شاہی میں پیش کیا تھا۔ جس کا خاطر خواہ صلہ ملا۔ رشید مرحوم کے پاس اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا پورا قرآن شریف موجود تھا +

زمین کی طرف دیکھتے ہی نہ تھے۔ کونسی مثال دی جائے۔ کس کا نام لکھا جائے۔ اُس وقت کے ناموروں کے تذکروں کا ہر ہر ورق ایک نئی مثال پیش کرنے کو تیار ہی بہت ٹھیک خیال ہی کہ دہلی اُجڑی۔ اور لکھنؤ آباد ہوا۔

امرائے لکھنؤ کی اولوالعزمیاں حدا عتدال سے متجاوز ہو چکی تھیں۔ دہلی کے ضعف کا کوئی خاص اثر لکھنؤ پر نہ تھا۔ علوم قدیمہ کا وقار دلوں میں باقی تھا۔ خصوصاً فنِ شعر جس کا عالمگیر اثر اس ناداری کے زمانہ میں بھی بہت سے دلوں پر قادر ہی۔ اُس وقت کے رؤسا کے درباروں کا ایک گلدستۂ زینت تھا۔ جس نے دہلی کو الوداع کہا وہ لکھنؤ یا حیدرآباد جا بسا +

افسوس ہی کہ میر صاحب کے مزید حالات نہ مل سکے۔ جو درج کیے جاتے خود جنابِ رشید مرحوم سے جیسا معلوم ہو سکا تھا۔ وہ لکھا گیا۔ کیونکہ کسی تاریخ کی کتاب میں اُن کے خاندان اور کسب معاش کے متعلق کچھ نہ ملا + البتہ آغا میر کا ذکر ملتا ہی۔ صاحب تاریخ اودھ عبارتِ ذیل لکھتے ہیں جس سے عالی نسبی اور سیادت کی شہادت ملتی ہی

"ازاں جملہ نواب معتمدالدولہ آغا میر کی علوئے نسب پدری و شرافت و سیادت۔ وحُسنِ لیاقت۔ اور مروّت خاص۔ اور سیر چشمی و رفقا پروری بہت غنیمت تھی"

(معتمدالدولہ آغا میر سید ذوالفقار علی کے بھتیجے تھے)

سید ذوالفقار علی میرزا

یہ بزرگ غالباً زمانہ محمد شاہ میں کشمیر سے دہلی آئے۔ اور کسی وزیر کے نائب ہوئے اور خطاب میرزا حاصل کیا۔ یہی وجہ ہو کہ اُن کی اولاد و احفاد کے نام کے ساتھ لفظ میرزا ضرور ہوتی ہو۔ بعد اس کے سید ذوالفقار علی میرزا دہلی سے لکھنؤ آئے اور یہاں آکر سکونت اختیار کی

لفظ میرزا کی تحقیق

اس لفظ کے متعلق جہاں تک تحقیق ہوئی اُس سے معلوم ہوتا ہو۔ کہ لفظ میرزا کا جزو نام ہونا علامت سیادت کی نہیں۔ اگرچہ ایران میں یہ لفظ اطلاق سیادت کرتی ہو۔ مگر ہندوستان میں اس خصوصیت کے لیے مروج نہیں۔ چنانچہ صاحب بہار عجم لکھتے ہیں

"میرزا بیائے معروف ایں لفظ بیشتر از القاب پادشاہاں و شاہزادگان بود۔ دریں روزگار بر بزرگ زادگان و رئیس پسران اطلاق کنند۔ در ایران بر سادات نیز مجوز است۔ غالباً میر مخفف امیر است۔ پس معنی ترکیبیِ میرزا) امیر زادہ باشد + از زمانے کہ نادر شاہ در ہندوستان در آمد و در قبض و تصرف آورد۔ اطلاق میرزایاں بر محرران دفتر شاہی کنند کہ میرزائے دفتر عبارت از نویسندۂ دفتر خانۂ پادشاہی ہست"

مؤلف کے نزدیک چونکہ میر اصطلاحاً بمعنی سردار ہی جیسے میر آتش، میر سامان، میر بحر وغیرہ اسی طرح میرزا سے ملازمین دفتر شاہی کی گونہ عظمت ظاہر ہوتی ہی +

بہرحال سید ذوالفقار علی میرزا مع اپنے فرزند سید علی میرزا صاحب کے لکھنؤ آکر مقیم ہوئے۔ ان بزرگ نے دہلی کیوں ترک کی۔ اور لکھنؤ کیوں آئے۔ اس کی وجہ ظاہر ہی۔ کہ زوال سلطنتِ مغلیہ کے ہمراہ اہلِ قلم کا ستارہ بھی پستی کی طرف مائل ہونے لگا زمانہ نے ایسے ایسے نازک مزاج اور مستغنی دلوں کو حوادث کا نشانہ بنایا جو کبھی سوائے آسمان کے

سلسلۂ جناب رشید مرحوم
سجاد حسین شہید
مصطفیٰ میرزا رشید
احمد میرزا صابر
سید محمد میرزا انس
سید علی میرزا

دست و گریبان نظر آئیں۔ وہی شعر سہل ممتنع کہے جانے کے قابل ہی۔ جس میں صحت و جمال کی خوبی اپنی حد تک پہنچ چکی ہو۔ اور مناسبت الفاظ کی کسوٹی پر کس لیا گیا ہو۔
یہی صفت شاعر کو پختہ کار بناتی ہی یہی قادر الکلام کہلواتی ہی۔ یہی فردوسی کو فردوسی قاآنی کو قاآنی۔ سودا کو سودا۔ اور انیس کو انیس منواتی ہی۔
کسی واقعے یا مضمون کو نظم کر دینا کوئی مشکل امر نہیں۔ مگر اُس کو دلچسپ بنانا مشکل ہی ہزاروں شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ایک صدی دوسری صدی کو جو شعرا کی فہرست دیتی ہی۔ اُس میں مشکل سے چار پانچ نام ہوتے ہیں۔ اور بس۔
اس وقت اُردو شاعری کا سفینہ کھینے والے ہندوستان میں ہر طرف نظر آتے ہیں مگر زمانہ کی بے رُخ لہر خود اُنھیں کو اِدھر سے اُدھر تھپیڑے دیتی ہی کہ سنبھلنا مشکل ہی ساحل مراد پر پہنچنے کا کیا ذکر۔ بہر حال یہ بھی ایک قسم کا احسان ہی جس سے جس طرح بن پڑے کوشش کرے۔ کسی وقت تو کامیابی کی دیر نما صورت نظر آئے گی۔

اطلاعِ فن اطلاعِ فن کے متعلق یہ عرض ہی کہ سب سے پہلی ضروری چیز بھی ہی۔ اور سب سے آخر بھی۔ اور نہیں بھی۔ مگر شاعر کو نہایت ضروری ہی کہ مشقِ سخن سے پہلے فنِ شعر کے ابتدائی مسائل سے واقفیت حاصل کر لے۔ ورنہ بغیر اس کے خود اُس کی طبیعت کو اطمینان کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ ذوق و ناسخ کی طرح نہ سہی تو انیس و آتش ہی کی طرح سہی۔ گو چودھویں صدی کی شاعرانہ طوائف الملوکی نے فن کا سد باب کر دیا ہی۔ مگر جو خال خال فرد واقفِ فن اس وقت نظر آتے ہیں ان کے بعد اتنے بھی نہونگے۔
بس میرا تنگ میدان قلم جو لکھنا تھا لکھ چکا۔ اب یہ آخری صدا دے کے ختم کرتا ہی کہ
"اے نوجوانو! ہند کی خاک کو کیمیا بناؤ۔ اور اپنی مادری زبان کو سنوارو۔"

بے سود۔ اگر یہ قوت نہیں تو کچھ نہیں۔ لیکن جہاں یہ قوتیں برابر بجا برکام کرتی ہیں وہاں
خدا کی قدرت نظر آتی ہے۔ اور ان کا رکھنے والا جس رفیع نام سے پکارا جائے زیبا ہے۔

متقدمین شعرائے عجم میں فردوسی، اور متاخرین میں قاآنی ہے۔ اردو میں
سودا اور انیس ہیں۔ جن میں قوت اظہار درجہ کمال پر پائی جاتی ہے۔ اگرچہ دوسرے
نام بھی اسی سلسلہ میں لکھے جا سکتے ہیں۔ مگر یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ ہر ناظر کو اختیار
ہے کہ اپنی رائے کے موافق دوسرے نام بڑھا لے۔

مناسبت الفاظ

اظہارِ خیالات و جذبات کا قدرتی آلہ جو انسان کو فطرت کی طرف سے عطا
ہوا ہے وہ اُس کی مادری زبان ہے۔ جس قدر ہم اپنی زبان کے اصطلاحات و محاورات پر
قادر ہوں گے۔ اسی قدر ہماری شاعرانہ خوبیوں کو اظہار کا موقع ملے گا۔ یا یہ کہنا درست ہوگا
کہ جس کو جس قدر ملکہ اس خزانہ کے صرف کرنے کا حاصل ہوگا۔ اُسی قدر اُس کی خیالی تصویر
جواہر نگار نظر آئے گی۔

اسی مناسبت الفاظ کو زمانہ مرصع کاری کہتا ہے۔ اسی کو ملمع کاری۔ یہی
سخن طرازی ہے۔ یہی دل آویزی۔ خلاصہ یہ کہ یہی سب کچھ ہے

اس قوت کے جوہر اُسی وقت کھلتے ہیں۔ جب کسی مقرر کو دیر تک ایک گوف آبرو بر
مجمع کو مخاطب کرنا ہو۔ کسی مضمون کو مختلف رُخوں سے سمجھانا ہو۔ یا اُن کے جذباتِ طرب
یا جذباتِ الم کو برانگیختہ کرنا ہو۔ یا کسی واقعہ کو مسلسل بیان کرنا ہو۔ تو بغیر مناسبت الفاظ
سامعین خاطر خواہ متوجہ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح ایک مصنف یا مؤلف کو جب تک
مناسب تحریر کی قدرت نہو اُس وقت تک صرف کاغذ کا سیاہ کرنا ہے۔

ایک معنوی شاعر کی شناخت یہ ہے۔ کہ اُس کی نظم میں خیالات و مناسبات الفاظ

علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہی۔ یعنی

۱۔ صحتِ خیال ۲۔ قدرتِ اظہار

۳۔ مناسبت الفاظ ۴۔ اطلاعِ فن

یہ سب خوبیاں اگر کسی شاعر میں پائی جائیں تو بے شک وہ اک فطرتی شاعر ہی۔ مگر تجربہ یہ کہتا ہی کہ اس معدوم ہو جانے والے گروہ کے آخری دَور تک ایسے کاملین کے کم نام جمع ہو سکیں گے +

صحتِ خیال | یہی صحتِ خیال بعض اوقات شاعر کو اُن امور کا پتہ دیتی ہی جو عالمِ وجود میں ابھی نہ آئے ہوں۔ یہی قوّت شاعر اور پیشین گو کو ایک ہی درجہ پر لے آتی ہی۔ شاعر کا ذریعۂ اطلاع اُس کا ذہنِ رسا، اور فکرِ صائب ہی۔ برخلاف اس کے ایک پیشین گو کا ذریعۂ اطلاع اُس کا تزکیۂ نفس، اور صفائیِ باطن ہوتی ہی۔ اور دونوں میں یہی فرق ہی جس کی وجہ سے ایک ایسے شاعر کو جو قوّتِ استنباط رکھتا ہو دُنیا دوسری نظر سے دیکھتی ہی۔ اور ایک پیشین گو کو دوسری نظر سے۔ اس موقع پر بے اختیار غالبؔ کا یہ شعر یاد آگیا ؎

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگرچہ بظاہر ان دونوں کا میدانِ عمل ایک دوسرے سے جُدا نظر آتا ہی۔ مگر غرض دونوں کی خلق کی ایک ہی ہی۔ شاہ نعمت اللہ کے قصائد کی نسبت مشہور ہی کہ اُن میں تمام آئندہ کے حالات بالا جمال لکھ دیے گئے ہیں۔ اب آپ کی پسند پر ہی چاہے انھیں پیشین گو کا لقب دیجیے یا شاعر کا۔

قوّتِ اظہار | صحتِ خیال کے بعد قوّتِ اظہار کی باری آتی ہی۔ یہ قوّت بھی شاعر کے لیے ایسی ہی ضروری ہی۔ جیسے مذکورۂ بالا قوّت یعنی (صحتِ خیال) اس کے بغیر شاعر کا کوئی خیال صحیح صحیح عالمِ وجود میں نہیں آسکتا۔ اُس کی تمام فکریں رائگاں۔ اُس کے تمام منصوبے

اس بنا پر باطنی نظارہ کرنے والا کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُس کا اشتیاق اپنے مطمح نظر صورت کی تلاش میں کوئی مستقل حد قائم نہیں کر سکتا بلکہ ہر لحظہ بڑھتا ہی جاتا ہی۔ ہاں اگر خیال اور اضطرار کی کوئی حد معین ہوتی تو میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ تصویرِ قلم سے زیادہ تصویرِ خیال دلچسپ ہی+

یہ مسلّم ہی کہ شاعری اور مصوری ایک ہی درخت (خیال) کی دو بار آور شاخیں ہیں لیکن شاخِ مصوری شاعری کی گھنی شاخ کے سایہ میں جھونکے لے کے دلفریبیاں دکھاتی ہی کیونکہ مصور بھی پہلے شاعرانہ قوت سے کام لیتا ہی اُس کے بعد اندازہ سے اور پھر قلم سے اس وقت آپ کے سامنے میں نے دو تصویریں پیش کیں۔

۱۔ تصویرِ قلم ۲۔ تصویرِ خیال

تصویرِ قلم کی تکمیل کے لیے ان چیزوں کی سخت ضرورت ہی۔

۱۔ مصور کا صحیح اندازہ۔ ۲۔ حسبِ منشا قلم پر قدرت۔

۳۔ مناسبت اجزائے تصویر۔ ۴۔ سامان۔ رنگ وغیرہ۔

وہی قلم کار کامیاب سمجھا جاتا ہی جس کو یہ سب آسانیاں نصیب ہوں۔ اُسی خوش قسمت کے بنائے ہوئے نمونے اس نظر خوش کن تجارت کے بازار کو گرم رکھتے ہیں۔ گو اُس سے کم مرتبہ والے بھی ہمیشہ شہرت کے زینہ پر اُس کے برابر آنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جہاں فطرت کا دخل ہوتا ہی وہاں کوشش و کسب بے سود۔

افسوس ہی کہ اس فن کی قدر ہندوستان میں ابھی بالکل نہیں ورنہ اس کی ترقی کے ساتھ شاعرانہ ترقی بھی جاری رہتی۔

اسی طرح ایک تصویرِ خیالی کے لیے مندرجۂ ذیل چیزوں کی ضرورت ہی۔ جن کا عمل

شاعری و تاریخ

ارسطو کہتا ہی "شاعری انسانی بلند خیالی کے اظہار کا ایک عمدہ آلہ ہی" اسلاف کے کارنامے اور گذشتہ صدیوں کی تاریخیں سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دُنیوی حیثیت سے مختلف افراد کے زوال و عروج کی تصویریں پیش کریں اور تہذیب و تمدن کے مدارج و ترقی کو زمانہ کی روش کے مطابق دکھائیں کیونکہ تاریخ کو صحتِ واقعات سے تعلق ہی اور شاعری کو نیرنگیِ خیال سے -

تاریخ کی غرضِ حقیقی یہ ہی کہ ہر موجودہ صدی کے افراد گذشتہ واقعات کا تطابق اپنے زمانہ سے کریں اور اپنے تجربے فرضِ عین سمجھ کر آنے والی صدیوں تک پُہنچائیں -

برخلاف اس کے شاعری اُن معاملاتِ انسانی کو پیش کرنے کے لیے نہیں جو عمل میں آچکے ہوں (تاریخی نظمیں اس بحث سے خارج ہیں - کیونکہ وہ شاعری کی اصل منشا کو پورا نہیں کرتیں) یا جن پر اصولِ فطرت کے مطابق معرضِ وجود میں آنے کا احتمال ہو بلکہ تصوّر کی پیدا کی ہوئی وہ تصویر جس کو صرف رُوحِ انسانی ہی محسوس کر سکتی ہو اور جو کسی جامۂ ظاہری کی محتاج نہو اس اعجاز نما فن کے ذریعہ سے ایسی ہی نمایاں صورت میں پیش ہو سکتی ہی جس طرح ایک صحیح قلم مصوّر کسی جادو نگار مرقع کو صفحۂ کاغذ پر دکھاتا ہی +

تصویرِ خیال و تصویرِ قلم

قوّتِ تصوّر کی پیش کردہ تصویر کے متعلق میں اپنی مستقل آواز میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ فطرت نے اُس میں وہ دلچسپیاں ودیعت رکھی ہیں جس کا دسواں حصّہ بھی کاغذی تصویر کو میسّر نہیں آسکتا - وجہ یہ ہی کہ موخر الذکر (یعنی کاغذی تصویر) مشاہدہ کرنے والے کے جذبۂ اشتیاق کو ایک حد تک مطمئن کر سکتی ہی - مگر چونکہ شعر کا اُتارا ہوا نقشہ کوئی مستقل حدِ تکمیل نہیں رکھتا - بلکہ ہر غور کرنے والے کے احساساتِ خیالی یا جذباتِ اضطراری کی رسائی کی مناسبت سے اُس میں تغیر و تبدل کے رنگ چڑھتے اُترتے ہیں -

میں جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی۔ اور جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر کا ممنون ہوں۔ ان دونوں حضرات نے مجھ کو مختلف واقعات رشید دیے۔ اور وقتاً فوقتاً میری ہمت افزائی کرتے رہے تاکہ میں جلد سے جلد اس تالیف کو ختم کروں۔ جناب نواب مجن صاحب جھجیا۔ اور جناب بڈھن صاحب فرہاد لکھنوی کا ممنون ہوں ان حضرات نے مجھ کو فراہمی کلام رشید میں مدد دی ہے۔ جناب مولوی سید احمد حسن صاحب ہاتف وکیل۔ اور جناب منشی علی محمد صاحب نظم سیتاپوری کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اول الذکر کے مشورہ ہائے صائب سے مستفید ہوا ہوں۔ اور آخر الذکر کے ذخیرۂ کتب سے اکثر مدد ملی ہے۔ آخر میں معظمی جناب سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی پروفیسر مدرسۂ عالیہ ریاست رامپور کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ موصوف نے اس مسودہ کو سن کے میری عزت افزائی کی ہے۔ اور بیش بہا مشورے دیے ہیں۔

ناظرین کی خدمت میں ایک مختصر عرض اور کرنا چاہتا ہوں۔ اور عبارت کو ختم کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ علاوہ اصل واقعات کے اگر کوئی رائے غیر صائب ہو۔ یا کوئی بحث کسی صاحب کو پسند نہ آئے تو وہ میرے قلم کی کوتاہی ہے۔ جس کا میں ہر وقت معترف ہوں اور رہوں گا۔

احقر

سید آغا اشہر لکھنوی

خود جناب رشید سے اُن کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ اور کچھ مرتب بھی کر چکے ہیں"
اب مجھ کو اس کے متعلق مزید سوال کی گنجائش نہ رہی۔ بلکہ یہ سُن کر مسرت ہوئی کہ رشید کے
حالات ایک سنجیدہ قلم سے شائع ہونگے۔

جنابِ رشید کے انتقال کے بعد ایک روز پھر میں نے جناب حمید مرحوم
سے عرض کی "ابھی تک کوئی تالیف رشید کے متعلق شائع نہیں ہوئی" مرحوم نے
فرمایا "نہ اُمید ہے" میں نے عرض کی "اگر میں کوشش کروں تو آپ مدد دینگے" فرمایا"
بسرو چشم۔ لیکن اگر مولوی محمد تقی صاحب شادماں سے وہ نامکمل حالات مل سکیں
جو اُنھوں نے اس غرض سے فراہم کیے ہیں تو زیادہ بہتر ہوگا" میں نے کہا "بہت خوب"
چنانچہ ۱۹۱۸ء میں صرف اس غرض سے میں رامپور گیا۔ اور مولوی صاحب موصوف سے
خواہش کی کہ وہ مجھے حالات جنابِ رشید دے دیں۔ اُنھوں نے مجھ کو اپنا نیاز مندِ
قدیم سمجھ کے وہ تمام ذخیرہ جو اُن کے پاس موجود تھا۔ میرے حوالہ کیا۔ جو اس تالیف کے
مندرجہ ذیل حصوں پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

(۱) جنابِ اُنس کے حالات قریب قریب مرتب۔
(۲) رشید کے حالات غیر مرتب (یعنی صرف اُن کے مرثیہ پڑھنے کے مقامات کا مختصر حال
باقی تمام حالات ضروری بڑی کوشش سے خود فراہم کیے جو اس ترتیبی صورت میں موقر
ناظرین کے سامنے پیشکش ہیں۔

جنابِ رشید کے حالاتِ زندگی اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ مرحوم
نے اپنی تمام عمر گوشۂ عافیت میں گذار دی۔ دوسرے مرثیہ گوئی کا اہم کام اُن کے ذمہ
ایسا تھا کہ اُن کو کُنجِ عزلت سے نکلنے سے روکتا تھا۔

ترقی اُردو کی ایک طرف اور مرثیہ گوئی ایک طرف۔ جب غور کیجیے گا اس صنفِ سخن کو مفید پائیے گا اس سے قطع نظر کرکے کہ عام اہلِ اسلام کے لیے عموماً۔ اور شیعہ حضرات کے لیے خصوصاً مرثیہ کا ایک حصہ (اصل واقعاتِ کربلا) مذہبی دلچسپی رکھتا ہی۔ مگر اس کے علاوہ اُس کے دوسرے اجزا مثلاً بیانِ شجاعت، بیانِ عفت، بیانِ سخاوت، بیانِ عدالت یا وہ اوصاف جو ان کے تحت میں آتے ہیں۔ مثلاً ایثارِ نفس، صبر وغیرہ عام انسان کے لیے متحد ہیں اور سب کے جذباتِ اضطراری سے دائمی تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا دُنیا کے ہر مذہب کے افراد کے لیے مرثیہ میں یکساں دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔

یہی سب باتیں تھیں جنھوں نے مجھ کو رشید کے حالاتِ زندگی لکھنے پر آمادہ کیا کہ آخر میں نے اُسے ختم ہی کرکے چھوڑا اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَالمِنّۃ۔

دُنیا میں یوں تو ہر شخص تعلقات اور مجبوریوں کا بندہ ہی۔ دوسرے انسان کو زمانہ کسی خاص مصروفیت کے لیے بہت کم وقت دیتا ہی۔ لیکن باوجود اس کے اگر ایک خود ساز طالب علم جس کو کتاب سے دائمی تعلق ہوگیا ہو۔ اپنے مصروف اوقات کا کچھ حصہ ادبی خدمت میں صرف کرے تو اُس کی زندگی کے وہ لمحے دلچسپی کی نظر سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔

جنابِ رشید مرحوم مجھ پر بہت عنایت فرماتے تھے اور مجھ کو بھی اُن سے ایک خاص اُنس تھا۔ ایک مرتبہ شاید ۱۹۱۴ء میں میں نے عرض کی "آپ اپنے کچھ حالات قلمبند کرا دیجیے۔ تاکہ آپ کے بعد اُردو بولنے والوں کے سامنے پیش کرکے اُن کو آپ کی ادبی خدمتوں کا معترف کیا جائے" جواب ملا "کیا ضرورت ہی" دوسری مرتبہ میں نے اس کا ذکر جناب سید باقر صاحب حمیدؔ مرحوم سے کیا۔ اُنھوں نے فرمایا "جناب مولوی سید محمد تقی صاحب شادماںؔ لکھنوی سکنڈ پروفیسر مدرسہ عالیہ ریاست رامپور نے

اُس کے عادات و اطوار و اخلاق و علم کا اثر ضرور پڑے گا۔ اور بعض اُس کی پیروی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کی سوانح عمریاں آئندہ نسلوں کے لیے ایک قسم کی درسی کتابیں ہیں۔ خصوصاً کسی زبان کے زبردست ادیب کے حالاتِ زندگی از اول تا آخر خود ادب ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر شخص کو اپنے علم ادب سے جس قدر دلچسپی ہوتی ہے اُتنی اُس کے غیر سے ہرگز نہیں ہوتی۔ اس علمِ ادب میں وہ تمام باتیں مجموعۃً ملتی ہیں جو علیحدہ علیحدہ علوم میں نظر آتی ہیں +

یورپ آج کل زبان زبان اُبھار رہا ہے۔ اشاعتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ دُنیا کے چاروں کونے مغربی زبان کی تصنیفات و تالیفات سے مملو نظر آتے ہیں۔ انسانی تمدن میں اصلاحات کے پردہ میں تغیر و تبدل ہو رہا ہے۔ روشِ سلطنت اور ہی رُخ چاہتی ہے +

خصوصاً ہندوستان میں انگریزی علم ادب کو تو اس قدر توسیع ہوئی ہے کہ اُس کے ادیبوں کے بیشتر نام وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو اُس زبان سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ انگلینڈ کا کیا ذکر۔ ہندوستان کا ہر بے پڑھا لکھا آدمی میر، غالب، انیس کو ہرگز نہیں جانتا۔ مگر انگلینڈ میں پیدا ہونے والا ہومر، شیکسپیر، ملٹن کو ضرور جانتا ہے اور فخر کرتا ہے کہ اُس کی قوم میں ایسے جوہرِ قابل پیدا ہوئے ہیں +

کاش ہم کو بھی زمانہ فرصت دے اور اس قابل بنائے کہ ہم بھی اپنی ملکی زبان کے برقرار رکھنے میں ہم آواز ہوں ! +

شاعری اور مرثیہ

زمانۂ خلیق تک فنِ مرثیہ گوئی محدود تھا۔ خلیق نے اُس پر کچھ اضافہ کرکے آگے بڑھایا۔ انیس و دبیر ایسے کامل افراد نے اس آلۂ ترقی اُردو کو اس قدر توسیع دی کہ اگر آنے والی نسلیں اُس کا صحیح استعمال بے کم و کاست کرتی رہیں تو سب کوششیں

عرضِ مؤلف کسی فردِ کامل کے واقعات زندگی کو جمع کر کے عوام کے سامنے پیش کرنا میری رائے میں ایک اجرِ معقول رکھتا ہی جس کا معاوضہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ناممکن ہی۔ یہ ایک ایسا احسان ہی جو اُس اہلِ فن پر ہوتا ہی جس سے اُس فرد کو تعلق ہو۔ مثلاً اگر کسی فاضل کے حالاتِ زندگی لکھے جائیں تو پڑھنے والے کو جابجا دلچسپ باتیں علم و فضل کے متعلق ملیں گی۔ اُس وقت کے فلسفہ۔ منطق۔ ریاضی۔ ادب۔ فقہ وغیرہ کے بہتر سے بہتر جاننے والے اُس ایک فرد کی وجہ سے صفحاتِ تالیف میں نمایاں نظر آئیں گے۔ اُس خاص دور کے لوگوں کا کسی خاص صنفِ علم کی طرف انہماک کا اظہار ہو جائے گا۔ اُس صنف کی تصنیفات و تالیفات کے متعلق پڑھنے والے کو اطلاع ہو جائے گی۔ حاکمِ وقت کی روشِ حکومت۔ اور اُس کے زمانہ میں جو کوششیں علوم و فنون کے برقرار رکھنے میں کی گئی ہونگی معلوم ہو جائیں گی اور پڑھنے والے سے داد طلب ہونگی۔

المختصر اگر کسی مقتدر فرد کے حالاتِ زندگی اچھی طرح مرتب ہو جائیں تو پڑھنے والے

بعونہ

یہ

تالیف حقیر

محسن رشید

قدردانِ اہلِ سخن عالیجناب معلّٰی القاب نواب

بہرام الدولہ بہادر رئیس اعظم حیدرآباد دکن

کے

نام نامی سے معنون کی جاتی ہے تاکہ

باعثِ افتخار ہو

حقیر

مؤلف

بعونہ

لکھنؤ کے مشہور شاعرِ مرثیہ گو جناب پیارے صاحب رشید کے حالاتِ زندگی

مع تصویر

المسمیٰ بہ

حضرتِ رشید

۲۲ ۶ ۱۹

مع

انتخابات مراثی و رباعیات و قصائد و سلام و غزل وغیرہا

مؤلفہ

سید آغا اشہر لکھنوی

اصح المطابع تھوئی ٹولہ لکھنؤ

صفدر علی رامپوری

باہتمام محمد قادر بخش مالک مطبع ہذا

ملنے کا پتہ (جناب تحفہ صاحب چاہ کنکر لکھنؤ

Ashhar Lakhnavi, Sayid Aghā
Ḥaẓrat Rashid